جلد ۹۳ جولائی ۱۹۸۰ء عدد ۵

ماہنامہ

# ترجمان القرآن

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

# اعترافِ عظمت

عین الحسین نون

☆ سیّد مودودیؒ کی وفات پر مشاہیر اہلِ قلم کی آنسوؤں، آہوں اور سسکیوں میں ڈوبی ہوئی خصوصی تحریریں۔

☆ ملک کے نامور جرائد اور اخبارات سیّدؒ کے کارناموں کو اُجاگر کرتے ہیں۔

قیمت:۔۔۔۔۔ ۳۹/- روپے

ملنے کا پتہ

مکتبہ تعمیرِ انسانیت۔ اُردو بازار۔ لاہور

اِدارہ ترجمان القرآن۔ اچھرہ۔ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

# فہرست مضامین

جلد ۹۳ | جولائی ۱۹۸۰ء مطابق شعبان ۱۴۰۰ھ | عدد ۵



ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور
۵ - اے ذیلدار پارک - اچھرہ - لاہور
فون نمبر ۴۱۰۱۶ — ۴۱۰۱۶ — ۴۰۳۱۶
زر سالانہ بیس روپے - فی پرچہ -/۲ روپیہ
سید حسین فاروق مودودی نے اپنے فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔
پرنٹر: سید حسین فاروق مودودی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# اشارات

اپریل سے اشارات کا ایک خاص سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔ جون میں رسالے کی ترتیب کچھ ایسی رہی کہ اشارات کو مختصر کر کے لکھا گیا اور ایک مفصل مربوط مبحث کے بجائے گفتگو کی چند چھوٹی چھوٹی کڑیاں بیان کی جاسکیں۔ وہ بھی پوری نہ آسکیں۔ پچھلی مرتبہ چند صفحے بچ گئے، وہ اس مرتبہ دیے جا رہے ہیں۔

اب جو چند ابواب فکر ذہن میں باقی ہیں، خدا سے امید ہے کہ وہ انہیں مسلسل اور مربوط طور پر بیان کرنے کی توفیق دے گا اور ان کا سلسلہ دو تین ماہ میں مکمل ہو جائے گا۔ جملہ محبتوں سے درخواستِ دعا۔

---

ایک عرصے سے ترجمان القرآن کی اشاعت ماہ بہ ماہ صحیح وقت پر نہیں ہو رہی۔ کئی بار کوشش کی گئی کہ چول سے چول ٹھیک بیٹھ جائے۔ مگر ادارت، کتابت، سنسر، طباعت اور نظامت کے پانچ مراحل میں کہیں نہ کہیں ہر مرتبہ کوئی خلل آجاتا ہے۔ مثلاً پچھلا پرچہ ادارت و کتابت کی منزلیں ۱۵ رجون تک طے کر گیا مگر رسالہ چھپ کر دفتر میں ۲۹ رجون کو پہنچا۔ تاہم عمل کی اس گرانی کا یہی علاج ہے کہ حدی خوانی کو تیز تر کر دیا جائے۔ چنانچہ اب جولائی کے شمارے میں صرف چند صفحات کی کمی ہے، اغلباً ۴، ۵ تک کام مکمل ہو جائے گا۔ اگر انتظامی اور طباعی عمل میں کوئی خلل نہ پڑا تو کوئی وجہ نہیں کہ رسالہ ۱۲ رجولائی تک روانہ نہ ہو جائے۔ ایسا ہو تو اگست کا شمارہ یکم یا اس سے پہلے آسکتا ہے۔

اس کے لیے ہم بھی خدا سے مدد مانگتے ہیں، آپ سب بھی آمین کہیں۔

---

اوّلین اصول یہ کہ کسی کھلے دَور میں سیاست کا اسٹیج بھی اگر استعمال کیا جائے تو اپنی بات کی اُٹھان سچی خدا پرستی اور پیروئ رسالت (صلی اللہ علیہ وسلّم) سے اُٹھائی جائے اور تمام گفتگو کا محور یہ تصوّر ہو کہ کسی شخص یا گروہ کی دشمنی فی نفسہٖ مطلوب نہیں ہے، اور نہ کسی کی بے جا پاسداری ہمارا راستہ صرف دین کے تقاضوں کو غالب کرنے کا ہے۔

دوسرا یہ کہ سیاسی اسٹیج کے علاوہ اور بھی بہت سے دائرے ہیں ——— مسجدوں کا دائرہ دینی تقاریب کا دائرہ، تعلیم گاہوں کا دائرہ، ادب کا دائرہ ——— ان میں سے جس بھی دائرے میں بات کرنے کا موقع ملے، اپنے وسیع جذبۂ خیر خواہی اسلام و مسلمین بلکہ سعیٔ فلاحِ انسانیت کو پوری طرح نمایاں کیا جائے اور صاف صاف طریق سے یہ بات واضح کر دی جائے کہ کوئی کسی بھی مذہبی یا سیاسی گروہ سے تعلق رکھتا ہو اور ہمارے لیے مخالفانہ جذبات رکھتا ہو یا مخالفانہ ہم سب کو سعادتِ دارین کی یکساں دعوت دیتے ہیں، اور سب کو گہرے جذبۂ محبت سے پکارتے ہیں۔

اور تیسری اہم بات یہ کہ انفرادی دائروں میں مختلف طریقوں سے رابطے پیدا کر کے ہر قسم کے لوگوں تک پوری دعوتِ اسلامی کو پہنچایا جائے۔ ابتداً بات خواہ کسی وقتی مسئلے سے چھڑے یا موسم سے، آہستہ آہستہ اصل موضوع تک پہنچ جانا چاہیے۔ لوگوں سے پوچھیے کہ جو زندگی گذار رہے ہو، کیا وہ سکون کی زندگی ہے؟ کیا تمہیں کسی خلاء یا گھٹن کا احساس نہیں ہوتا؟ پوچھیے کہ یہ دولت پرستی اور اسراف کے تماشے اور گرانی اور معیارِ زندگی کی دوڑ، ان کا تجربہ کرنے کے بعد کیا محسوس کرتے ہو؟ ———

تمہیں ہر طرف سے بدعنوانی اور خیانت اور زیادتی کا خوف لاحق نہیں رہتا؟ کیا جرائم کی وجہ سے تم اپنے آپ کو ہر جگہ غیر محفوظ نہیں سمجھتے ہو؟ پھر جب انسانوں کے دلوں میں چھپے ہوئے کانٹے گرفت میں آجائیں تو اُن کو بتلایئے کہ ان کا علاج صرف ایک ہی ہے۔ خدا کی ہدایت اور رسول اللہؐ کا اسوہ، لوگوں سے کہیے کہ تم کسی بھی فقہی فرقے سے تعلق رکھتے ہو، تم جس بھی سیاسی گروہ سے اپنے آپ کو وابستہ کیے ہوئے ہو۔ تم خواہ ووٹ ہمارے کسی مخالف کو دیتے ہو، ہم ان بحثوں میں نہیں پڑتے صرف تمہاری بھلائی کے لیے توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ خدا کو صحیح طریق سے مانو، اس کے دین کو بتلائے کے چلو، رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلّم کے لائے ہوئے قرآن کو پڑھو، سمجھو اور اسے غالب کرنے کی کوشش کرو۔ لوگوں سے کہیے کہ وہ تمام لوگ جو خدا کے کلمہ کو سوچ سمجھ کر قبول

کریں وہ مل جُل کر معاشرے کو بُرائیوں سے بچانے کی جدوجہد کریں اور اگر اس کام میں ہمارے ساتھ ہوکر چلنا پسند ہو تو بسم اللہ!

میں یہاں اسلام کی اساسی دعوت کے لیے تمام مختلف اسالیب کو طرح طرح کی عبارتوں میں جمع نہیں کر سکتا، میرا منشا یہ ہے کہ دعوتِ حق کو عوام میں پہنچانے کا طریق کار کیا ہونا چاہیے۔

اس طریق سے اگر ایک شخص مہینے میں دس آدمیوں سے تفصیلی رابطہ پیدا کرتا ہو تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ ایک برس میں بہت سے افراد کو تحریک اسلامی کے دروازے پر لاکھڑا کرے گا۔

یہ کام چھوٹی موٹی مجالس اور تقریروں کے ذریعے بھی ہونا چاہیے۔ ایسی مجالس میں تقاریر کا انداز اتنا دلنشین ہونا چاہیے کہ موافق اور مخالف لوگ خود بخود کھنچے چلے آئیں۔ ایک دفعہ جہاں ایسی آواز بلند کی گئی ہو، وہاں کئی دنوں تک محلوں اور گھروں میں اس کا چرچا ہونا چاہیے۔ یہاں تک کہ اگر دوبارہ وہاں ایسا انتظام کیا جائے تو بغیر کسی لمبے چوڑے پروپیگنڈے کے معمولی اطلاع پر خاصی تعداد مجلس میں شریک ہو جائے۔ کم تعداد ہو تو کوئی ضروری نہیں کہ آپ لاؤڈ اسپیکر استعمال کریں یا اونچی اونچی آواز میں تقریر کریں۔ نہیں، ان کے درمیان بیٹھ کر دھیمی دھیمی باتیں کریں۔ ایسی باتیں جو سننے والوں کو سوچنے پر مجبور کر دیں، ان کے ذہنوں میں تحریک پیدا کریں، اور ان کے اندر کچھ نئے سوالات اپنے متعلق بھی اور معاشرے کے متعلق بھی ابھرنے لگیں۔

ایسی ہر مجلس اور ہر تقریر کے بعد لوگوں کو مزید وقت دیا جائے کہ ہم لوگ فلاں جگہ ٹھہرے ہیں۔ وہاں اتنے بجے سے اتنے بجے تک اگر آپ میں سے کوئی صاحب یا آپ کے حلقۂ تعارف میں سے کوئی دوست ہم سے مل کر کوئی بات پوچھنا چاہیں تو ہم منتظر رہیں گے۔ یہ صورت کہ جلسے یا مجلس میں تقریر ہوئی اور مطلع صاف، یہ تو مؤثر قسم کی سیاست کے لیے بھی کافی نہیں، کجا کہ دینِ حق کی دعوت کا معاملہ ہو۔

پتہ ماری کا یہ مشکل کام ہے جس کے بدلے میں ہم لوگ جلسوں اور پوسٹروں پر اکتفا کر لیتے ہیں، نتیجہ یہ کہ وقتی معاملات سے متعلق رابطے پیدا ہوتے ہیں، لیکن بنیادی دعوت کے متاثرین کے حلقے تیزی سے وسیع نہیں ہوتے۔ اور دعوت کے اثرات کہیں پڑتے بھی ہیں تو سرسری قسم کے، ویسے نہیں جیسے پہلے کبھی ہوتے تھے۔ یعنی جس نے پیغام کو قبول کیا اس کی فکری اور عملی زندگی

میں ہل چل مچ گئی۔

یہی صورت از سرِ نو پورے زور سے جاری رہنی چاہیے۔ ہماری ساری کامیابی کا دار و مدار اسی پر ہے۔ اس کے بغیر نہ کوئی انتخاب نتیجہ خیز ہوگا، نہ انقلاب!

---

توسیعِ دعوت اور توضیحِ دعوت میں جو کمی ابھی ہے، اس کا بہت بڑا اثر تحریک ۱۹۷۷ء میں محسوس ہوا۔ برسوں سے اسلام کے تحریکی تصور پر کام کرنے والوں نے یہ منظر دیکھا کہ لمبی محنت سے انہوں نے جو فصل اُگائی تھی اُسے کاٹنے کے لیے ہاتھ موجود ہوتے۔ حقیقتِ دین، دعوتِ حق اور نظریۂ تبدیلی کی وضاحت کے لیے نادر لٹریچر کے فیلیے، پریس اور پلیٹ فارم کے ذریعے، نیز انفرادی سطح پر کام کیا جاتا رہا۔ لوگوں کے سوالات کے جوابات دیے جاتے رہے، اعتراض کا توڑ کیا گیا، دَورِ جدید کے ادارات پر اسلامی اصولوں کے انطباق کی بحثیں ہوئیں۔ آج کے بعض مسائل کے متعلق اجتہادی راہِ عمل کی نشاندہی کی گئی، اصولِ تدریج کی اہمیت زیرِ غور آئی، مگر جب فیصلے کا وقت آیا تو اوسط درجے کا مذہبی آدمی یہ اندازہ نہ کر سکا کہ آپ میں اور دوسروں میں فرق کیا ہے؟ آپ نے اسلامی نظام کا سفر طے کرتے ہوئے جو مصیبتیں اُٹھائی تھیں اور جو سنگِ میل نصب کیے تھے، اُن کی طرف کثیر التعداد لوگوں کی توجہ نہیں گئی۔ دیا اُن کو جیسے کچھ معلوم ہی نہ ہوا۔ بس ایک سلوگن کے ساتھ لوگ بہتے جا رہے تھے۔ جو آپ کو پہچانتے تھے وہ آپ کے ساتھ ہو کر، اور جو کسی دوسری طرف دلچسپی رکھتے تھے وہ اُدھر وابستہ ہو کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ تحریک کے منفی پہلو نے جو اتحاد پیدا کر رکھا تھا وہ مثبت پہلو میں برقرار نہیں رہ سکا، بلکہ مثبت پہلو سے تو ایسے ایسے لطیفے ہوئے کہ سر پکڑا جاتا رہا۔ قسمیں کھا کھا کر کہا جاتا رہا کہ ایک گھنٹے میں اسلامی نظام (یا نظامِ مصطفےٰ) قائم ہو سکتا ہے۔ آپ جس جامد اور فرقہ پرست مذہبیت سے لوگوں کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ اب اسی کی صفِ قیادت آپ کے ساتھ شانہ ملائے کھڑی تھی اور آپ مجبور تھے کہ اس کو عوام کے احترام و توجہ کا مستحق بنائیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سارا خوابِ تحریک پریشان ہو گیا۔

اس سے سبق کیا ملا؟ سبق یہ ملا کہ اس جذباتی سیلِ عوام میں جو خاصی وقیع تعداد آپ پر

اعتماد کرتے ہوئے آپ کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی، وہ ایسے لوگوں پر مشتمل تھی جنہوں نے آپ کی دعوت کو سمجھا تھا اور آپ کے طریقِ کار اور آپ کے تصوّرِ نظام کے امتیازی خدوخال سے آگاہی حاصل کر رکھی تھی۔ بقیہ وہ تمام لوگ جن کے جذبۂ دینی میں تو وقتاً فوقتاً حرکت پیدا کی جاتی رہی تھی۔ لیکن دعوت کی تفہیم پوری طرح نہ ہو سکی تھی، وہ جن لوگوں کے حلقۂ اثر میں تھے، انہی کے ساتھ اقدام کرتے رہے۔ اگر اس بقیہ تعداد کو یا اس کے بڑے حصّے کو بھی پچھلے سالوں میں اقامتِ دین، غلبۂ دین اور طریقِ انقلاب کا شعور دلایا جا سکا ہوتا تو وہ بھی آپ کا ساتھ دیتے۔

اب آئندہ کے لیے ایسا پروگرام بنانا چاہیے کہ آبادیوں کے اندر اتر کر، لوگوں پر وقت صرف کرکے، انہیں اقامتِ دین کے طریقِ کار کا شعور دلایا جائے۔ اُن کے ٹیڑھے میڑھے جذبات کو درست کیا گیا۔ اُن کے ذہنوں سے زنگ اُتارا جائے۔ اُن کے شکوک اور اندیشوں کا ازالہ کیا جائے، اُن کے مغالطوں کو رفع کیا جائے، اُن میں جو فرقہ واریت اور گروہ پرستی کام کر رہی ہے، اُسے بہت ہی احتیاط سے محو کیا جائے۔ یہاں تک کہ وہ دُنیا بھر کی اسلامی تحریکات کے مجموعی قافلے کے ساتھ چلنے کے قابل ہو جائیں۔

اس اشد ضروری کام میں ٹال مٹول سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اس خلاء کو دوسری ظاہر و محسوس سرگرمیوں سے پُر نہ کیا جا سکے گا، اور اس کوتاہی کے نقصانات سے آئندہ کے کسی فیصلہ کُن تاریخی لمحے میں بچا نہ جا سکے گا۔

پھر کیوں نہ ہم میں سے ہر شخص اس بنیادی کام کی اہمیت پر زور دے، کیوں نہ ہم دوسروں کو بھی اس پر توجہ دلاتے رہیں۔ اور کیوں نہ ایسا ہو کہ اگر کوئی دوسرا اُسے کماحقہٗ کرنے یا کرانے والا نہ بھی ہو تو ہم بطورِ خود اُسے انجام دیں؟

میرا ذہن اس بارے میں شروع سے یکسو ہے، میں جتنا ۱۹۴۸ء تا ۱۹۵۰ء کے دور میں سیاسی اہمیت پر زور دیتا رہا ہوں، ——— اس وقت بھی میری توجہ دعوت کے اساسی کام سے نہیں ہٹی اور آج بھی میرا شعور جوں کا توں ہے میرا نقطۂ نظر تو یہ ہے کہ تمام سیاسی سرگرمیوں کا بھی اہم ترمفاد یہ ہے کہ وہ دعوت کے لیے نئے راستے بنانے کا ذریعہ ہوں۔

---

بنیادی اصولی دعوت پر اتنا زور دینے کا مطلب یہ نہیں کہ اگر ہمارے اردگرد آگ لگ جائے تو ہم اسے بجھانے کے لیے کچھ نہ کریں اور آگ لگانے والوں یا بھڑکانے والوں کو بھی دعوت ہی دیتے رہیں۔ نہیں ہم ایک طرف آتش فروزوں کے ہاتھ پکڑنے اور ان کو بے بس کرنے کی کوشش کریں گے، اور دوسری طرف آگ بجھانے کے لیے پورا زور لگائیں گے۔

بسا اوقات کسی ملک یا قوم کے عین وجود کے لیے، اس کے اساسی نظریے کے لیے، یا اس کی آزادی کے لیے یا اس کے اندر صحیح کام کرنے کی کھلی فضا کے لیے خطرات پیدا ہو جاتے ہیں۔ دنیا میں بہت سے ملک ایسے ہیں جن کے لیے خود ان کی حکومت ہی بہت بڑا سامانِ ضرر بن جاتی ہے، کہیں اپوزیشن کے مورچے پر کوئی خطرناک عنصر قابض ہو جاتا ہے، کہیں بیرونی طاقتیں اپنے زرخرید ایجنٹوں کو تخریبی عمل کے لیے مامور کر دیتی ہیں۔ ان ساری صورتوں میں جدھر جدھر سے کوئی خطرہ نمودار ہو اس کی زد سے قوم کو بچانے کی سعی کرنا ہر داعیِ اسلام کا فرض ہے، جب کہ قوم اور ملک سے اسلامی مقاصد کی تکمیل کی امیدیں وابستہ ہوں۔

آج ہم جس قسم کے حالات سے دوچار ہیں اس میں پاکستان اور اس میں بسنے والی امتِ اسلامیہ بیک وقت کئی اطراف سے خطروں کی زد میں ہے۔ ایسے حالات میں داعیانِ اسلام پر جو فرض عاید ہوتا ہے، انھیں اپنی نگاہ بصیرت سے اسے پہچاننا چاہیے۔ جہاں بیرونی خطرات سر پر لٹکے ہوئے ہوں وہاں اندر کی مصیبتوں پر صبر کر کے توجہ ادھر کرنی پڑتی ہے۔ بعدہٗ کوئی راستہ ملے تو حکومت ہو یا اپوزیشن کا ذہن رکھنے والے عناصر یا عوام، ان میں سے ہر ایک کے لیے جذبۂ خیر خواہی رکھتے ہوئے ان کی اصلاح کی سعی کرنی چاہیے، اور کسی بھی جانب سے کوئی غلط چیز نمودار ہو اس پر گرفت کرنی چاہیے۔

کسی ملک کے لیے بڑی آزمائش ہوتی ہے، اگر اس کی حکومت کا رخ درست نہ ہو، لیکن اس سے بھی بڑی بدقسمتی یہ ہوتی ہے کہ اس کی اپوزیشن کے عناصر محض منفی سوچ بچار رکھتے ہوں لیکن مثبت حیثیت سے نہ ان کے پاس صحیح نظریہ ہو، نہ کردار، نہ مردانِ کار۔ بلکہ وہ غلط سے غلط سلوگن اور ہتھکنڈے اختیار کر سکتے ہوں اور برے سے برے عناصر کے ساتھ تعاون پر تیار ہوں۔ اور اس سے بھی زیادہ بڑی بدقسمتی یہ ہوتی ہے کہ کوئی قوم خود اپنے

بھلے بُرے سے بیگانہ ہو جائے اور اُس کے افراد محض ذاتی زندگی بنانے اور کمائیاں سمیٹنے اور نفر بجات سے لطف اٹھانے میں لگ جائیں۔

یہ کہنے کی جرأت کیسے کی جائے کہ ہمیں کونسی آزمائش اور کون کون سی بدقسمتی درپیش ہے۔ لیکن ایک بات کہی جا سکتی ہے کہ کچھ نہ کچھ مشکل امتحانی لمحات سے ہم گزر رہے ہیں اور کئی قوتیں ہمارے وجود کو مٹانے اور مسخ کرنے اور اُسے دوسروں کی غلامی میں دینے کے لیے سرگرم عمل ہیں۔

ایسے حالات میں آپ سیاسی دائرے کو چھوڑیے اور جلسوں کو بھول جائیے، سیدھے اپنے عوام اور شہریوں تک پہنچیے اور اُن سے انفرادی سطح پر دین، ایمان، آزادی اور سالمیت وطن کی بات کیجیے۔ لوگوں کے ذہنوں کو جمود اور انتشار کی حالت سے نکال کر دین برحق کے تقاضوں پر متحرک کیجیے اور پیش آمدہ خطرات کی مزاحمت کے لیے انہیں تیار کیجیے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ جتنا جلد ممکن ہو، آپ معاشرے کے کارآمد عنصر کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو اُٹھا کھڑا کریں جو دعوتِ اسلامی کے سلسلے میں محض آپ کی تائید کرنے والے اور نعرے لگانے والے ہی نہ ہوں بلکہ وہ اس دعوت کو اپنی چیز سمجھیں۔ انہیں براہ راست اس کا فہم حاصل ہونا چاہیے۔ اور اُن کے دلوں میں اس کی قدر ہونی چاہیے، اُن کے اندر اس کے لیے محنت اور قربانی کا جذبہ ہونا چاہیے۔ وہ نظامِ اسلام کے برپا ہونے کے لیے بے چین جذبات رکھتے ہوں۔ اس مہم میں ہمہ تن مصروف ہوں۔ ناواقف لوگوں کے شکوک و شبہات کے جواب دے سکیں۔ عام لوگوں کی غلط فہمیوں کا ازالہ کر سکیں۔ مایوسانہ رجحانات سے لوگوں کو نکال سکیں، مخالفوں کی مخالفت کا مقابلہ کر سکیں۔ اور شریر لوگوں کی شرارتوں کو ناکام کر سکیں۔ آپ انہیں کسی کام کے لیے پکاریں تو وہ چاروں طرف سے لبیک کہتے ہوئے لپکیں۔ دین اور خادمانِ دین کے معاندین اگر ارادۂ بد سے کوئی حرکت کریں تو وہ ان کا راستہ روک کر کھڑے ہو جائیں۔ نظامِ حق کا قیام عمل میں آئے تو اپنے اندر سے اُسے چلانے کے لیے باصلاحیت افراد فراہم کریں۔ اور اُن کی بقیہ تعداد اس کا خیر مقدم کرنے والی اور خوش دلی سے اُسے اپنے اوپر نافذ کرنے اور اُسے آگے تک پھیلانے والی ہو۔

پھر دعوتِ اسلامی کی مسلسل چلتی رہنے والی مہم کے نتیجے میں ہر شعبۂ زندگی میں مردانِ کار اُبھر آئیں،

(باقی بر صفحہ ۴۸)

(گزشتہ سے پیوستہ)

# تذکرۂ انبیاء

## علیہم السلام

از

**مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مغفور**

## باب دوم ــــــــــ قصۂ ہابیل و قابیل

### فصل ۱ تا ۲

## فصل ۱

# قرآن کا بیان

| | |
|---|---|
| وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ ابْنَيْ آدَمَ | اور ذرا انھیں آدمؑ کے دو بیٹوں کا قصہ بھی |
| بِالْحَقِّ ۘ إِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ | بے کم و کاست سنا دو۔ جب اُن دونوں نے |
| مِنْ أَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ | قربانی کی تو ان میں سے ایک کی قربانی قبول کی |
| الْآخَرِ قَالَ لَأَقْتُلَنَّكَ ۖ قَالَ | گئی اور دوسرے کی نہ کی گئی۔ اس نے کہا: "میں |
| إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ | تجھے مار ڈالوں گا۔" اس نے جواب دیا "اللہ |
| لَئِنْ بَسَطْتَ إِلَيَّ يَدَكَ | تو متقیوں ہی کی نذریں قبول کرتا ہے۔ اگر تو |
| لِتَقْتُلَنِي مَا أَنَا بِبَاسِطٍ يَدِيَ | مجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ اٹھائے گا تو میں |
| إِلَيْكَ لِأَقْتُلَكَ ۖ إِنِّي أَخَافُ | تجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ نہ اٹھاؤں گا، میں |
| اللَّهَ رَبَّ الْعَالَمِينَ ۝ إِنِّي أُرِيدُ | اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔ میں چاہتا |
| أَنْ تَبُوءَ بِإِثْمِي وَإِثْمِكَ | ہوں کہ میرا اور اپنا گناہ تو ہی سمیٹ لے اور |
| فَتَكُونَ مِنْ أَصْحَابِ النَّارِ ۚ وَذَٰلِكَ | دوزخی بن کر رہے۔ ظالموں کے ظلم کا یہی ٹھیک |
| جَزَاءُ الظَّالِمِينَ ۝ فَطَوَّعَتْ لَهُ | بدلہ ہے۔" آخرکار اس کے نفس نے اپنے بھائی |
| نَفْسُهُ قَتْلَ أَخِيهِ فَقَتَلَهُ فَأَصْبَحَ | کا قتل اس کے لیے آسان کر دیا اور وہ اسے |
| مِنَ الْخَاسِرِينَ ۝ فَبَعَثَ اللَّهُ غُرَابًا | مار کر اُن لوگوں میں شامل ہو گیا جو نقصان اٹھانے |
| يَبْحَثُ فِي الْأَرْضِ لِيُرِيَهُ كَيْفَ | والے ہیں۔ پھر اللہ نے ایک کوا بھیجا جو زمین |
| يُوَارِي سَوْءَةَ أَخِيهِ ۚ قَالَ | کھودنے لگا تاکہ اُسے بتائے کہ اپنے بھائی کی لاش |
| يَا وَيْلَتَا أَعَجَزْتُ أَنْ أَكُونَ | کیسے چھپائے۔ یہ دیکھ کر وہ بولا افسوس مجھ پر! |

| | |
|---|---|
| مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَأُوَارِيَ سَوْءَةَ أَخِي ۚ فَأَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِينَ ۝ | میں اس کوّے جیسا بھی نہ ہوسکا کہ اپنے بھائی کی لاش چھپانے کی تدبیر نکال لیتا۔ اس کے بعد وہ اپنے کیے پر بہت پچھتایا۔ |
| (المائدہ ۵۔ آیات ۲۷ تا ۳۱) | |

---

# فصل ۲

# توضیحات

## قربانی کے عدم قبولیت کی وجہ

"قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ" یعنی تیری قربانی اگر قبول نہیں ہوئی تو یہ میرے کسی قصور کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس وجہ سے ہے کہ تجھ میں تقویٰ نہیں ہے، لہذا میری جان لینے کے بجائے تجھ کو اپنے اندر تقویٰ پیدا کرنے کی فکر کرنی چاہیے۔

## مقابلۂ ظلم کے لیے ظالمانہ اقدام سے اجتناب

"مَا اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ اِلَيْكَ" اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر تو مجھے قتل کرنے کے لیے آئے گا تو میں ہاتھ باندھ کر تیرے سامنے قتل ہونے کے لیے بیٹھ جاؤں گا اور مدافعت نہ کروں گا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تو میرے قتل کے درپے ہوتا ہے تو ہو، میں تیرے قتل کے درپے نہ ہوں گا۔ تو میرے قتل کی تدبیر میں لگنا چاہے تو تجھے اختیار ہے، لیکن میں یہ جاننے کے بعد بھی کہ تو میرے قتل کی تیاریاں کر رہا ہے، یہ کوشش نہ کروں گا کہ پہلے میں ہی تجھے مار ڈالوں۔

یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ کسی شخص کا اپنے آپ کو خود قاتل کے آگے پیش کر دینا اور ظالمانہ حملہ کی مدافعت نہ کرنا کوئی نیکی نہیں۔ البتہ نیکی یہ ہے کہ اگر کوئی شخص میرے قتل کے درپے ہو اور میں جانتا ہوں کہ وہ میری گھات میں لگا ہوا ہے تب بھی میں اس کے قتل کی فکر نہ کروں اور اسی بات کو ترجیح دوں کہ ظالمانہ اقدام اس کی طرف سے ہو نہ کہ میری طرف سے۔ یہی مطلب تھا اس بات کا جو آدم علیہ السلام کے اس نیک بیٹے نے کہی۔

---

لہ قرآن کے بیان سے یہ بات ثابت ہے کہ قربانی دورِ آدم علیہ السلام سے خدا کی رضا حاصل کرنے کا ذریعہ تھی۔ (مرتبین)

## دوگونہ گناہ کی ذمہ داری قابیل پر

"اِنِّیْٓ اُرِیْدُ اَنْ تَبُوْٓءَ بِاِثْمِیْ وَاِثْمِكَ" یعنی بجائے اس کے کہ ایک دوسرے کے قتل کی سعی میں ہم دونوں گنہگار ہوں، میں اس کو زیادہ بہتر سمجھتا ہوں کہ دونوں کا گناہ تنہا تیرے ہی حصے میں آجائے، تیرے اپنے قاتلانہ اقدام کا گناہ بھی، اور اس نقصان کا گناہ بھی جو اپنی جان بچانے کی کوشش کرتے ہوئے میرے ہاتھ سے تجھے پہنچ جائے۔

## کوّے کے ذریعے قابیل کو اس کی جہالت پر انتباہ

"فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِی الْاَرْضِ" اس طرح اللہ تعالیٰ نے ایک کوّے کے ذریعے سے آدمؑ کے اس غلط کار بیٹے کو اس کی جہالت و نادانی پر متنبہ کیا۔ اور جب ایک مرتبہ اس کو اپنے نفس کی طرف توجہ کرنے کا موقع مل گیا تو اس کی ندامت صرف اسی بات تک محدود نہ رہی کہ وہ لاش چھپانے کی تدبیر نکالنے میں کوّے سے پیچھے کیوں رہ گیا، بلکہ اس کو یہ بھی احساس ہونے لگا کہ اس نے اپنے بھائی کو قتل کر کے کتنی بڑی جہالت کا ثبوت دیا ہے۔ بعد کا فقرہ کہ وہ اپنے کیے پر پچھتایا، اسی مطلب پر دلالت کرتا ہے۔

## قصے میں مدینہ کے یہودیوں کی سازشوں پر ملامت

یہاں اس واقعہ کا ذکر کرنے سے مقصد یہودیوں کو ان کی اس سازش پر لطیف طریقے سے ملامت کرنا ہے جو انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے جلیل القدر صحابہؓ کو قتل کرنے کے لیے کی تھی۔ دونوں واقعات میں مماثلت بالکل واضح ہے۔ یہ بات کہ اللہ تعالیٰ نے عرب کے اِن اُمّیوں کو قبولیت کا درجہ عطا فرمایا اور اُن پرانے اہل کتاب کو رد کر دیا، سراسر اس بنیاد پر تھی کہ ایک طرف تقویٰ تھا اور دوسری طرف تقویٰ نہ تھا۔ لیکن بجائے اس کے کہ وہ لوگ جنھیں رد کیا گیا تھا، اپنے مردود ہونے کی وجہ پر غور کرتے اور اس قصور کی تلافی کرنے پر مائل ہوتے جس کی وجہ سے رد کیے گئے تھے، ان پر ٹھیک اُسی جاہلیت کا دورہ پڑ گیا جس میں آدمؑ کا وہ غلط کار بیٹا مبتلا ہوا تھا۔ اور اُسی کی طرح وہ ان لوگوں کے قتل پر آمادہ ہو گئے جنھیں خدا نے مقبولیت عطا فرمائی تھی۔ حالانکہ ظاہر تھا کہ ایسی جاہلانہ حرکتوں سے وہ خدا کے مقبول نہ ہو سکتے تھے، بلکہ یہ کرتوت انہیں اور زیادہ مردود بنا دینے والے تھے۔

## بنی اسرائیل کو قتل سے پرہیز کی خصوصی تاکید

| | |
|---|---|
| مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۛ كَتَبْنَا عَلٰى | اسی وجہ سے بنی اسرائیل پر ہم نے یہ فرمان لکھ |
| بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا | دیا تھا کہ جس نے کسی انسان کو خون کے |
| بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ | بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی |
| فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَمَنْ | اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں |
| اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ | کو قتل کر دیا اور جس نے کسی کی جان بچائی اس |
| جَمِيْعًا (المائدہ - آیت ۳۱) | نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش دی۔ |

یعنی چونکہ بنی اسرائیل کے اندر انہی صفات کے آثار پائے جاتے تھے جن کا اظہار آدمؑ کے اس بیٹے نے کیا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو قتل نفس سے باز رہنے کی سخت تاکید کی تھی[۱] اور اپنے فرمان میں یہ الفاظ لکھے تھے۔ افسوس ہے کہ آج جو بائیبل پائی جاتی ہے وہ فرمان خداوندی کے ان قیمتی الفاظ سے خالی ہے۔ البتہ تلمود میں یہ مضمون اس طرح بیان ہوا ہے "جس نے اسرائیل کی ایک جان کو ہلاک کیا۔ کتاب اللہ کی نگاہ میں اس نے گویا ساری دنیا کو ہلاک کیا۔ اور جس نے اسرائیل کی ایک جان کو محفوظ رکھا، کتاب اللہ کے نزدیک اس نے گویا ساری دنیا کی حفاظت کی۔" اسی طرح تلمود میں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ قتل کے مقدمات میں بنی اسرائیل کے قاضی گواہوں کو خطاب کر کے کہا کرتے تھے کہ "جو شخص ایک انسان کی جان ہلاک کرتا ہے وہ ایسی باز پرس کا مستحق ہے کہ گویا اس نے دنیا بھر کے انسانوں کو قتل کیا ہے۔"

## انسانی جان کے احترام کا اصول

"مَنْ قَتَلَ نَفْسًا ........ الخ مطلب یہ ہے کہ دنیا میں نوع انسانی کی زندگی کا بقا منحصر ہے

---

[۱] کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ حرمت قتل کا حکم بنی اسرائیل ہی کو دیا گیا تھا اور اس سے پہلے کسی قوم کے لیے شریعت الٰہیہ نے قتل کو جرم قرار نہیں دیا تھا۔ یہ بات تو خود قصۂ ہابیل و قابیل میں آگئی ہے کہ ہابیل اپنے بھائی کو سمجھاتے ہوئے قتل کے گناہ کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اوّلین پیغمبر آدم علیہ السلام کے ذریعے قتل کے گناہ ہونے کی تعلیم دی جا چکی۔ یہاں بنی اسرائیل کے متعلق ایک مخصوص سلسلۂ بیان میں جو ذکر ہوا ہے اس کا منشا یہ ہے کہ یہ قوم جو نبی آخرالزمان صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے پر اسے اور اس کے ساتھیوں کو قتل کرنے کی سازشیں کر رہی ہے اسے تو خاص طور پر قتل سے باز رہنے کا حکم دیا گیا تھا (مرتبین)

اس پر کہ انسان کے دل میں دوسرے انسان کی جان کا احترام موجود ہو اور ہر ایک دوسرے کی زندگی کے بقاء و تحفظ میں مددگار بننے کا جذبہ رکھتا ہو۔ جو شخص ناحق کسی کی جان لیتا ہے وہ صرف ایک ہی فرد پر ظلم نہیں کرتا بلکہ یہ بھی ثابت کرتا ہے کہ اس کا دل حیاتِ انسانی کے احترام سے اور ہمدردیِ نوع کے جذبہ سے خالی ہے، لہٰذا وہ پوری انسانیت کا دشمن ہے، کیونکہ اس کے اندر وہ صفت پائی جاتی ہے جو اگر تمام افرادِ انسانی میں پائی جائے تو پوری نوع کا خاتمہ ہو جائے۔ اس کے برعکس جو شخص انسان کی زندگی کے قیام میں مدد کرتا ہے وہ درحقیقت انسانیت کا حامی ہے، کیونکہ اس میں وہ صفت پائی جاتی ہے جس پر انسانیت کے بقاء کا انحصار ہے۔

(باقی)

## آیت اللہ امام خمینی کی کتاب "حکومت اسلامیہ" کا دیباچہ

# اسلامی انقلاب کی نفیر

ترجمہ: جناب محمد نصر اللہ خان خازن

(ا)

"ولایت فقیہ" ایک واضح علمی نظریہ ہے جس کے لیے کسی دلیل و برہان کی چنداں حاجت نہیں ہے خصوصاً ہر وہ شخص جو اسلام کے عقاید و احکام کو اچھی طرح سمجھتا ہو، اس پر یہ حقیقت پوری طرح واضح ہے۔ لیکن آج مسلم معاشرے اور ہمارے علمی اداروں کی ساخت و پرداخت خاص کر اس نوعیت کی ہے کہ یہ حقیقت عام لوگوں کے اذہان سے اوجھل ہو چکی ہے اور ہمیں آج پھر اسے لوگوں کے ذہن نشین کرانے کے لیے دلیل و برہان کی ضرورت ہے۔

تحریک اسلامی کو ہمیشہ یہودیوں کے ہاتھوں ابتلاء و آزمائش سے گزرنا پڑا ہے۔ یہودیوں نے اوّل روز ہی سے اسلام کے خلاف اپنی معاندانہ سرگرمیاں جاری کر رکھی ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ اسلام کی اعلیٰ دعوت اور پاکیزہ تعلیمات کو مسخ کر کے پیش کیا ہے۔ اس کے خلاف تعصب و افترا پردازی کے تیر برسائے ہیں۔ اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ ماضی میں ایک طویل دَور ایسا گزرا ہے جس میں بہت سی ایسی جماعتیں اور ایسے گروہ عالمِ ظہور میں آئے جنہوں نے اسلام کی ہیئت اجتماعی اور تنظیم سیاسی کو اتنا بڑا نقصان پہنچایا ہے جو شیطان اور اس کی ذرّیت کے پہنچائے ہوئے نقصان سے بھی کہیں زیادہ ہے۔

یہ وہ دور ہے جس میں استعماری طاقتوں نے ہر طرح کی گمراہی و ضلالت سے لیس ہو کر عالم اسلام پر حملہ کر دیا اور اپنے مکروہ عزائم کی تکمیل کے لیے ایسے حالات پیدا کیے جن میں اسلام کی تمام اقدار کو ملیا میٹ کیا جاسکے۔ گذشتہ تین صدیوں سے استعماری طاقتوں کی یہ مساعی اپنے عروج پر ہیں۔ بظاہر یہ طاقتیں اپنی یہ سرگرمیاں مسلمانوں کی اجتماعی فلاح و بہبود کے نام پر جاری رکھے ہوتے ہیں لیکن فی الحقیقت ان کے پیش نظر مسلمانوں کی معاشی زندگی میں ان کی مدد کرنا نہیں ہے —— نہ ہی وہ مسلمانوں کی مخلصانہ امداد کرنا چاہتی ہیں —— بلکہ وہ تو مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کر کے ان میں نظریاتی اور سیاسی اثر و نفوذ چاہتی ہیں۔ کیونکہ انہوں نے صلیبی جنگوں کے زمانہ ہی سے یہ حقیقت اچھی طرح سمجھ لی ہے کہ ان کے مقاصد کی تکمیل میں جو سب سے بڑی رکاوٹ حائل ہے اور جس کی وجہ سے ان کی سیاسی عمارت ریت کے ڈھیر پر کھڑی ہے وہ اسلام ہے، جس کی سیاسی و معاشرتی تعلیمات، جس کے اجتماعی و معاشی احکام اور جس کے دینی عقائد و نظریات ان کے افکار و نظریات کے بالکل ضد ہیں۔ نیز ان کے سدِ راہ بننے والی چیز جذبۂ ایمان ہے جو اہلِ اسلام کے دلوں میں موجزن ہے۔ محض اسی لیے وہ اسلام کے خلاف تشکیک و ریب اور افترا و بہتان کے ہتھیاروں سے حملہ آور ہیں۔ اور عوام کی آنکھوں میں مکر و فریب کی خاک جھونک رہے ہیں۔ اور اسی مقصد کے لیے یہ استعماری طاقتیں عیسائی مشنریوں، مستشرق محققین اور ذرائع ابلاغ پر پانی کی طرح روپیہ بہا کر ان کے ہاتھ مضبوط کر رہی ہیں۔ یہ سب لوگ ان استعماری قوتوں کے آلۂ کار بنے ہوتے ہیں۔ ان کا منتہائے مقصود سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ لوگوں کے سامنے اسلام کے حقائق کو مسخ کر کے اور اس کی تعلیمات میں تحریف کر کے پیش کیا جاتے تاکہ عوام الناس بالعموم اور جدید تعلیم یافتہ لوگ بالخصوص اسلام سے برگشتہ ہو جائیں اور وہ کبھی بھی راہ ہدایت نہ پاسکیں۔

اسلام دراصل ان مجاہدین کا نام ہے جو دنیا میں حق و انصاف کا بول بالا دیکھنا چاہتے ہیں، جو دنیا میں حریت و آزادی کے علمبردار ہیں۔ جو کفار کو اہل ایمان پر کسی طرح غلبہ پانے کا موقع فراہم نہیں کرنا چاہتے۔ لیکن اعداء اسلام نے ہمیشہ اسلام کو اس کے بالکل برعکس رنگ میں پیش کیا ہے۔ انہوں نے عام لوگوں کے ذہنوں میں اس کی مسخ شدہ صورت نقش کی ہے اور علمی مراکز میں تشکیک و ریب کے بیج بوئے ہیں۔ درپردہ ان کا مقصد وحید یہ رہا ہے کہ اہل ایمان کے دلوں میں ایمان کی جو ہلکی سی

چنگاری اب تک سلگتی رہ گئی ہے اُسے سرد کر دیں۔ اور اُن کے اندر جذبۂ انقلاب ماند پڑ جائے۔ تاکہ مسلمان دُنیا میں ایسی حکومت کے قیام کے ذریعے اپنی قومی آزادی اور نفاذِ شریعت کے لیے سعی نہ کرنے پائیں جو دُنیا میں اُن کے لیے عزت و وقار اور سعادت و برکت کا باعث بنے۔ کبھی انھوں نے یہ غلط فہمی پیدا کی کہ معاشرے کی اجتماعی زندگی اور اس کے اجتماعی مسائل سے اسلام کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ نہ ان مسائل کے حل کے لیے کسی حکومت کے قیام سے کوئی سروکار۔ بلکہ اسلام تو محض انفرادی زندگی کے چند مسائل اور چند اخلاقی ضابطوں سے بحث کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے پاس اور کچھ نہیں ہے۔ افسوس ہے کہ اس طرح کی ہفوات کے بُرے اثرات نہ صرف یہ کہ عوام الناس پر پڑتے رہے ہیں۔ بلکہ جدید تعلیم گاہوں میں زیرِ تعلیم نوجوان نسل اور طالبانِ دینی علوم بھی اس زہر سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ نوجوان نسل غلط راہوں پر جہالت کی تاریکیوں میں بھٹکتی پھر رہی ہے۔ سچ ہے اسلام آج ہمارے اندر اسی طرح اجنبی ہو کر رہ گیا ہے جس طرح کہ غریب لوگ عوام میں اجنبی بن کر رہ گئے ہیں۔ اندازہ کیجیے کہ کل داعیانِ اسلام کو لوگوں کو اسلام سے روشناس کرانے میں کتنی مشکل پیش آئے گی۔ جب کہ استعمار کے کارندوں کی ایک جماعت نے پورے وسائل کے ساتھ اپنی ہفوات سے آسمان سر پر اُٹھا رکھا ہوگا اور حق کی آواز کان پڑی سُنائی نہ دے گی۔

میں چاہتا ہوں کہ حقیقی اسلام اور اس اسلام کے درمیان جو عوام کے ہاں معروف ہے، فرق واضح کرنے کے لیے آپ کی توجہ اس فرق کی طرف مبذول کروں جو ایک طرف قرآن اور کتبِ حدیث میں اور دوسری طرف قرآن و حدیث اور موجودہ فقہی کتب میں موجود ہے۔ قرآن اور حدیث دونوں اسلامی قانون سازی کے اہم ترین مآخذ ہیں جو فقہ کی ان کتب سے نمایاں طور پر مختلف ہیں جو فقہا و مجتہدین نے بعد کے ادوار میں تالیف کی ہیں۔ اس لیے کہ قرآن اور کتبِ حدیث میں زندگی کے جملہ پہلوؤں پر جامع ہدایات ملتی ہیں۔ چنانچہ آپ دیکھیے اجتماعی مسائل سے تعلق رکھنے والی آیات اُن آیات سے کئی گنا زیادہ ہیں جن کا تعلق محض عبادات سے ہے۔ دوسری طرف آپ حدیث کے بڑے بڑے مجموعوں کو ملاحظہ فرمائیں۔ کسی ایک میں بھی عبادات اور انسان کے تعلق باللہ سے بحث تین یا چار ابواب سے زیادہ نہ ہوگی۔ چند ابواب اخلاقیات کی بحث کے لیے مختص

ہوں گے۔ ورنہ اس کے علاوہ ان مجموعہ ہائے حدیث کا بہت بڑا حصہ اجتماعی اور معاشی مسائل، حقوقِ انسانی، مملکت کے انتظامی امور اور قیامِ امن و انصاف کے لیے دیوانی اور فوجداری قوانین پر مشتمل ہے۔

میں نوجوانانِ اسلام سے کہتا ہوں کہ آپ اسلام کے سپاہی ہیں۔ آپ کا فرض ہے کہ اس پر ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ غور کریں اور تحریر و تقریر اور سیرت و کردار میں سے جو وسائل بھی آپ کو میسر ہوں اُن کے ذریعہ اسلامی قوانین اور اسلامی نظام کے تمام شعبوں سے لوگوں کو متعارف کرائیں۔ اسلامی نظام کے بارے میں عوام کے ذہنوں میں موجود شکوک و شبہات کو دُور کرنے کی سرتوڑ کوشش کریں۔ اس مقصد کے لیے اپنی پوری زندگیاں وقف کر دیں۔ لوگوں کو سمجھائیں کہ اوّل روز سے اسلام کو بحیثیت نظامِ زندگی نافذ کرنے میں کونسی مشکلات اور رکاوٹیں درپیش ہیں۔ وہ کونسی قوتیں ہیں جو شروع سے اس کی مزاحم ہیں۔ جن حقائق کا آپ کو علم ہے۔ وہ بلاکم و کاست لوگوں تک پہنچائیں۔ لوگوں کو دین کی دعوت اس انداز سے نہ دیں کہ وہ یہ سمجھ بیٹھیں کہ اسلام بھی موجودہ عیسائیت کی طرح کا ایک مذہب ہے، جس میں صرف فرد کا رشتہ خدا سے قائم کرنے کی تلقین کی گئی ہے اور بس۔ یا یہ کہ مسجد اور کلیسا دونوں برابر ہیں ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔

جس زمانے میں مغربی دنیا پر جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی سیاہ فام حبشی امریکہ میں جاکر بس رہے تھے۔ ایرانی اور رُومی شہنشاہیت مطلق العنانیت کے ساتھ عوام کی گردنوں پر مسلط تھی۔ ہموطنوں کے ساتھ نسلی امتیاز برتا جارہا تھا۔ طاقت کے بل بوتے پر عوام کی آزاد مرضی اور رائے کے علی الرغم اور کسی قانونی حق اور جواز کے بغیر عوام پر حکومت کی جارہی تھی۔ عوام ہمہ گیر استحصال کا شکار بن چکے تھے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے اسلامی شریعت نازل فرمائی۔ اور ختمی رسالت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ساری دُنیا کے سامنے قوانین شریعت کو پیش کیا تاکہ ان کے سایۂ عاطفت میں انسانِ کامل پروان چڑھ سکے۔ ظاہر ہے کہ ہر کام کے کچھ اصول و ضوابط ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی پیدائش سے لے کر اس کی موت تک کے لیے ایسے قوانین و ضوابط وضع فرما دئیے ہیں جو اُس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو نظم و ضبط، امن و سلامتی اور عدل و انصاف سے ہمکنار کرکے اس کی فلاح و کامرانی کے ضامن بن سکیں۔ چنانچہ جہاں عبادت کے مراسم مقرر کیے گئے ہیں، وہاں معاشرتی

اصول اور نظمِ مملکت کے خدوخال بھی وضع کئے گئے ہیں۔ اسلام میں لوگوں کے حقوق اور ان کی حفاظت کے لیے مقررہ قوانین کا معیار نہایت بلند ہے۔ اگر سب لوگ ایک دوسرے کے حقوق ادا کریں اور ان قوانین کی پابندی کریں تو ہر شخص کی تکمیل ذات میں وہ قوانین ممد و معاون ثابت ہوں کیونکہ یہ قوانین حیاتِ انسانی کے جملہ شعبوں پر حاوی اور ہر پہلو سے مکمل اور جامع ہیں۔ دنیا کے مقننین نے اسلام کے احکام اور اس کے اجتماعی ادارات، اس کے معاشرتی اور تجارتی قوانین، اس کے ضابطہ ہائے دیوانی و فوجداری، اس کے نظامِ عدلیہ، اس کے بین الاقوامی ضوابط اور قوانینِ صلح و جنگ نیز راعی اور رعایا کے حقوق وغیرہ میں سے بہت کچھ اخذ کیا اور اپنے ہاں رائج کیا ہے۔ اسلام زندگی کے تمام مسائل کا حل پیش کرتا ہے اور اجتماعی نظام کو روبعمل لانے کے لیے ضروری احکام و ہدایات دیتا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ ہمارے عوام اور جدید تعلیم یافتہ لوگ بالخصوص اغیار کے اس پروپیگنڈے کا شکار ہو گئے ہیں کہ "اسلام تو محض طہارت کی طرح کے چند انفرادی مسائل کے مجموعے کا نام ہے اور علمِ دین حاصل کرنے والے انہی موضوعات پر خصوصی توجہ دیتے ہیں اور اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں جانتے۔"

بلاشک یہ بات کسی حد تک درست ہے کہ دینی علوم کے بعض طالبان کے نزدیک صرف انہی مسائل کی اہمیت ہے۔ وہ وسیع معنوں میں تحصیلِ علم سے قاصر رہتے ہیں۔ اِس طرح وہ اس وسعتِ علم اور وسعتِ نظر سے یکسر محروم رہتے ہیں، جس کا تقاضا اُن کا مرتبہ و مقام اور حالات کی ضرورت کرتی ہے۔ یہی کوتاہی دشمنانِ اسلام کے لیے حصولِ مقاصد کا ذریعہ بنتی ہے۔ یہ چیز ان استعماری طاقتوں کے لیے باعثِ مسرت ہے جو صدیوں سے ہمارے علمی مراکز اور جامعات میں سہل انگاری، غفلت شعاری اور کوتاہ نظری کے بیج بو رہے ہیں، تاکہ اس غفلت و جہالت، بے شعوری اور لاعلمی کی حالت میں وہ ہمارے مسلمان ممالک سے تمام وسائل رزق اور ساری دولت و ثروت سمیٹ سکیں اور ہمیں اسلام اور اس کی برکات سے محروم کر سکیں۔

بسا اوقات یہ قوتیں اس طرح کا زہر یلا پروپیگنڈا کرتی ہیں کہ "اسلام ایک ناقص اور از کار رفتہ (OUT OF DATE) نظامِ زندگی ہے۔ عدل و انصاف کے بارے میں اس کے احکام و قوانین جدید ترقی یافتہ حالات سے مطابقت نہیں رکھتے۔" جب آپ بنظر غائر مطالعہ کریں گے

تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس مکر و فریب اور ہلاکت و گمراہی میں فرنگیت نواز حکمرانوں اور ~~آئینی حکومت کے قیام کے بعد~~ ۔ جنہوں نے ایران میں مشہور سیاسی انقلاب اور آئینی حکومت کے قیام کے بعد ہمارے عوام و خواص میں اپنے نظامِ تعلیم کے ذریعہ غیر اسلامی اور وضعی قوانین کی مقبولیت کو فروغ دیا، ملک میں جب قانون اساسی یعنی دستور کا ابتدائی خاکہ بننے لگا تو ان حکمرانوں نے سب سے پہلے بلجیم کے سفیر کے توسط سے بلجیم کے قوانین کو اپنا لینے کا ارادہ کیا۔ ان میں سے کچھ "غیر خواہانِ قوم" ملے ——— میں اس وقت ان کا نام لینا مناسب نہیں سمجھتا ——— اور انہوں نے بلجیمی قوانین کی بعض خامیوں کی فرانسیسی اور انگریزی قوانین کے ذریعہ اصلاح و ترمیم کر کے ایک ایسا مسودۂ آئین مرتب کیا جس میں شاطرانہ طریقہ سے لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے "اسلامی قوانین" کی پیوندکاری بھی کر دی گئی تھی۔ اس آئین میں ایسی دفعات رکھی گئیں جن کے ذریعے حکومت کے سارے اختیارات فردِ واحد کے ہاتھ میں دے دیے گئے تھے۔ گویا دستوری نظام بھی شہنشاہی نظام اور موروثی نظام ہی کا چربہ تھا جو بلجیم اور انگلستان سے درآمد کیا گیا تھا۔ جس کے بیشتر اجزا مختلف یورپی حکومتوں کے دساتیر سے نقل کیے گئے تھے۔ یہ دستور کلیتہً اسلام کے خلاف اور اس کی روح اور مزاج سے قطعاً متصادم تھا۔

کیا اسلام میں شہنشاہیت یا موروثی حکومت یا ولی عہد کے تقرر کا کوئی جواز ہے؟ اسلام میں اس کی گنجائش کیسے ہو سکتی ہے؟ ہم یہ حقیقت اچھی طرح جانتے ہیں کہ شہنشاہی نظام اسلامی حکومت اور اسلام کے سیاسی نظام سے قطعاً مطابقت نہیں رکھتا۔ اسلام نے ملوکیت اور ولی عہدی کو باطل قرار دیا ہے۔ اسلام نے اپنے ابتدائی دور ہی میں ایران، مصر، یمن اور روم کی بادشاہی حکومتوں کو شریعت حقہ کے خلاف قرار دیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ہرقل شاہ روم اور شاہ فارس کو ایک نامہ گرامی لکھا تھا جس میں انہیں یہ دعوت دی گئی تھی کہ وہ لوگوں کو اپنا غلام بنانے سے باز رہیں اور انہیں اپنی آزاد فطرت پر چھوڑ دیں تاکہ وہ خدائے واحد کی عبادت و اطاعت کریں۔ کیونکہ حکومت و فرمانروائی کا حق صرف اسی کو حاصل ہے۔

ملوکیت اور اس کے زیر سایہ ولی عہدی اسلام کے نزدیک انتہائی مبغوض اور ناپسندیدہ طرزِ حکومت ہے جس کے خاتمے کے لیے حضرت امام حسین علیہ السلام نے اعلانِ جنگ کیا۔ آپ

یزید کی ولی عہدی اور حکومت کو اسلامی طرزِ حکومت کے خلاف سمجھتے تھے۔ اس کو بدلنے کے لیے آپ نے خود بھی عَلَمِ جہاد بلند کیا اور عوام کو بھی اس کی دعوت دی۔ کسی غیر اسلامی طرزِ حکومت کو اسلامی حکومت میں تبدیل کرنے کی یہ عملی کوشش تاریخی حیثیت رکھتی ہے جس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام میں موروثی بادشاہت کا کوئی جواز نہیں ہے۔ جب معترضین کے خیال میں کسی موروثی حکومت کو بدلنا ہی درست نہ ٹھیرا تو انہوں نے یہ پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ "اسلام ایک ناقص دین ہے"۔ اس خامی اور نقص میں مزید اضافہ اس بات کا ہوا کہ اسلام تو سودی نظام کے قیام و رواج کا بھی مخالف ہے۔ قحبہ گیری کو رجسٹریشن اور لائسنسوں کے اجراء کے ذریعے باقاعدہ منظم کرنے اور شراب کی کشید اور فروخت کی منصوبہ بندی کے لیے کسی محکمہ کے قیام و انصرام سے بھی اُسے کوئی سروکار نہیں۔ اسلام میں ان بُرائیوں کے رواج کے لیے کوئی قانون و ضابطہ نہیں ہے، اس لیے اس کمی کو پورا کرنے کی غرض سے غیر ملکی استعمار کے پروردہ حکمرانوں کو ایسے قوانین بنانے کی ضرورت محسوس ہوئی جس سے وہ ان سب خرافات سے مستفید ہو سکتے۔ چنانچہ انہوں نے انگلستان، فرانس، بلجیم اور امریکہ کے قوانین میں سے قوانین مستعار لیے۔ جنہیں انہوں نے غیر اسلامی طرزِ حیات اختیار کرنے میں ممد و معاون پایا۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ سب چیزیں شریعت اسلامی میں حرام ہیں۔ ہمارے لیے قابلِ فخر بات یہ ہے کہ اسلام میں اس طرح کی محرمات کے لیے بالخصوص کوئی محکمہ اور کوئی ادارہ نہیں ہے۔

برطانوی استعمار نے اس دستوری عہد کے اوائل میں دو مقاصد پر اپنی توجہ مرکوز رکھی۔ اوّلاً ایران میں روسی اثر و نفوذ کا استیصال اور ثانیاً اسلام کو تنفیذ و قانون سازی کے دائرے سے دُور رکھ کر اسلامی قوانین کی جگہ مغربی قوانین کی سعیِ اجراء و ترویج۔ مسلمان معاشرے میں غیر ملکی قوانین کی ترویج و تنفیذ کے نتیجے میں بہت سی مشکلات پیدا ہوئیں۔ چنانچہ ماہرین قانون و اجتماع اور اہلِ دانش محققین بلبلا اُٹھے۔ ان مغربی قوانین کی موشگافیوں کا عالم یہ ہے کہ ایران یا اسی طرح کے دوسرے مسلم ممالک میں جب کسی قانون دان کو کوئی مقدمہ عدالت میں پیروی کی غرض سے ملتا ہے یا کسی جج کی عدالت میں کوئی مقدمہ تصفیہ طلب آتا ہے تو وہ اپنی عمر کا بیشتر حصہ اس مشکل گتھی کو سلجھانے میں صرف کر دیتا ہے۔ ایک مرتبہ ایک چوٹی کے وکیل نے دورانِ گفتگو میں مجھے بتایا کہ وہ دو فریقین

کے درمیان کسی مقدمہ کو مختلف عدالتوں میں ساری عمر لڑ سکتا ہے اور اسے بہ گمان غالب بھی ہے کہ اس کے بعد اس کا بیٹا اسی مقدمہ کو اسی طرح مختلف عدالتوں میں سالہا سال تک لڑتا ہے اور یہ سلسلہ کہیں جا کر نہ رکے۔

آج یہ حقیقت عالمِ واقعہ میں موجود ہے۔ اس سے مستثنیٰ صرف وہی بااثر لوگ ہیں جو دھوکہ، فریب، حیلہ سازی، عیاری اور رشوت جیسے ناجائز ذرائع سے اپنے مقدمات کے جلد فیصلے کرا لیتے ہیں ۔۔۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ موجودہ عدالتی نظام اور قانونی ڈھانچہ لوگوں کے لیے حصولِ انصاف میں سہولت پیدا کرنے کے بجائے مشکلات پیدا کر رہا ہے۔ ایک مقدمہ جسے شرعی نظام دو یا تین دن میں نمٹا لیتا تھا اس پہ آج بیس بیس سال کی مدت لگ رہی ہے۔ اس طویل مدت میں صبح و شام بار بار عدالتوں کے لاحاصل چکر کاٹ کر ایک جوان آدمی کے سیاہ بال بھی سفید ہو جاتے ہیں اس عدالتی چکر میں عوام بیچاروں کا حال بھی ان دوزخیوں کا سا ہے کہ جب بھی وہ اس سے نکل بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں اسی میں دوبارہ دھکیل دیے جاتے ہیں۔

کبھی یہ معترضین اپنے رسائل و جرائد میں یہ لکھتے ہیں کہ "اسلام کے قوانین بڑے سخت ہیں" اور بعض تو پوری ڈھٹائی کے ساتھ یہ تک کہہ دیتے ہیں کہ "اسلام کے قوانین کی یہ سختی بدوی عربوں کی سخت مزاجی سے پیدا ہوئی ہے"۔ ان کے نزدیک عربوں کی سخت مزاجی ہی اسلامی قوانین کی سختی کا سبب ہے۔ مجھے ان لوگوں کے اندازِ فکر پہ سخت تعجب ہوتا ہے۔ وہ خود قانون کی آڑ میں چند لوگوں کی موت کی سزا دے دیتے ہیں تاکہ عوام ہیروئن (HERDIN) سے احتراز کریں[1]۔ مجھے ابھی یہ بات پہنچی ہے کہ کچھ دیر پہلے دس آدمیوں کو ہیروئن کے استعمال پہ موت کی سزا دے دی گئی ہے۔ پھر ایک اور شخص کو بھی یہی سزا دی گئی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ لوگ ہیروئن کے استعمال سے باز آجائیں۔ حالانکہ ان خلافِ انسانیت قوانین میں جنہیں وہ محض فتنہ و فساد روکنے کی خاطر جاری کرتے ہیں، انہیں کوئی سختی نظر نہیں آتی۔ اگرچہ میں ہیروئن کے استعمال کو جائز نہیں قرار دے رہا۔ تاہم میرے نزدیک یہ بات بھی درست نہیں کہ محض اس کے استعمال کی سزا موت ہو۔ بلاشک ہیروئن کے استعمال کی

[1] یہ معاملہ چونکہ اہلِ مغرب خصوصاً امریکہ کی خواہشات کے مطابق ہے اس لیے "سب اچھا" ہے۔

روک تھام انتہائی ضروری ہے اور اس مقصد کے لیے تعزیر بھی ضروری ہے۔ لیکن یہ تعزیر جرم کی سنگینی اور نوعیت کے مطابق ہونی چاہیے۔

تعجب کی بات ہے کہ شراب نوشی کے جرم میں ۸۰ کوڑے کی سزا تو سنگین معلوم ہوتی ہے، لیکن ہیروئن کے استعمال پر موت کی سزا دینے میں کوئی سنگینی نہیں! حالانکہ اکثر اجتماعی خرابیوں کی جڑ شراب نوشی ہے۔ سڑکوں پر گاڑیوں کے حادثات اور خودکشی کے سانحات حتیٰ کہ ہیروئن کی عادت ——— جیساکہ بعض کا خیال ہے ——— سب کا بنیادی سبب شراب نوشی اور نشہ آور اشیاء کا استعمال ہے۔ ان سب خرابیوں کے باوجود یہ شراب نوشی پر تو پابندی نہیں لگاتے اس لیے کہ ان کے مغربی آقاؤں نے اُسے مباح کر رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آزادانہ طریقے سے اس کی خرید و فروخت کرتے ہیں۔ جب اسلام شراب نوشی کی سزا اسّی کوڑے دیتا ہے یاکسی غیر شادی شدہ زانی کو ۱۰۰ کوڑے لگاتا ہے یاکسی شادی شدہ مرد یا شادی شدہ عورت کو زنا کے جرم میں سنگسار کرنے کا حکم دیتا ہے تو یہ اسلام کو کوسنے لگتے ہیں اور چیخ پکار شروع کر دیتے ہیں کہ اسلام کی سزائیں بڑی وحشیانہ اور سنگین ہیں۔ اور یہ سنگینی عربوں کی سخت مزاجی سے منتقل ہو کر آئی ہے۔ حالانکہ اسلام میں فوجداری جرائم کی سزائیں تو محض اس عظیم امت کو ——— جو ہر طرف سے طعن و تشنیع کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے ——— بدکاری، فحاشی اور فتنہ و فساد جیسی اخلاقی بیماریوں سے پاک رکھنے کے لیے نافذ کی گئی ہیں۔ اب آپ خود دیکھ لیں۔ یہ بگاڑ یہاں تک پہنچ چکا ہے کہ ہمارے نوجوان اس سیلاب میں بہے چلے جا رہے ہیں اور انتہائی پستی کی حد تک گر گئے ہیں۔ اس بگاڑ ہی نے ان کے گرنے کی راہ ہموار کی، پھر انہیں اس طرف دعوت دی۔ اسی بگاڑ کی دلدل میں گرانے کے لیے انہیں ضروری سہولتیں فراہم کی گئیں۔ اب جب ان حالات میں اسلام نے آگے بڑھ کر اہلِ ایمان کی ایک جماعت کی موجودگی میں شراب نوشی کے رسیا کو کوڑے لگانے کا فیصلہ کیا تو یہ لوگ اس افترا پردازی پر اُتر آئے ہیں کہ اسلام تو سنگینی اور خشونت کا دوسرا نام ہے۔ لیکن اس کے برعکس ویت نام[1] میں گزشتہ پندرہ سال سے ان علمبردارانِ تہذیب

(باقی بر صفحہ ۴۷)

[1] نیز افغانستان میں بھی۔

# حضرت امام مسلمؒ

## ۲۰۶ھ تا ۲۶۱ھ

جناب عبدالرشید عراقی صاحب

**نام ونسب** نام مسلم بن حجاج، کنیت ابوالحسین، لقب عساکرالدین، ۲۰۶ھ میں پیدا ہوئے۔ مقام پیدائش نیشاپور ہے، اور نیشاپور خراسان کا مشہور شہر ہے[۱]۔

**تحصیل علم** امام صاحب نے جب ہوش سنبھالا تو ہر چہار جانب علم حدیث کا غلغلہ تھا اور آپ کے اپنا مولد ومسکن شہر نیشاپور کو اس زمانہ میں مرکزیت کا مقام حاصل تھا۔ وہاں آپ نے مشہور اساتذہ حدیث سے تعلیم حاصل کی۔ ان اساتذہ میں امام اسحاق بن راہویہ اور امام ذہلی قابل ذکر ہیں۔

**سماع حدیث کے لیے سفر** امام صاحب نے سماع حدیث کے لیے عراق، حجاز، شام، مصر اور بغداد کے سفر کئے۔ بغداد کئی بار جانے کا اتفاق ہوا۔ بغداد کے قیام میں آپ نے وہاں درس حدیث بھی دیا ہے۔ آخری سفر بغداد کا آپ نے ۲۵۹ھ میں کیا[۲]۔

**اساتذہ وشیوخ** اساتذہ اور شیوخ کی تعداد گنانا مشکل اور تطویل الطائل ہے۔ تاہم آپ کے مشہور اساتذہ وشیوخ یہ ہیں:

عراق میں:۔ امام احمد بن حنبلؒ اور عبداللہ بن مسلمہ قعبنی

حجاز میں:۔ سعید بن منصور۔

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ ص ۱۶۵

[۲] سیرۃ البخاری ص ۱۱۴

مصر میں :- عمرو بن سواد اور حرملہ بن یحییٰ

نیشاپور میں :- امام محمد بن اسمٰعیل البخاری[1]

اور یہ وہ اساتذہ ہیں جن پر امام مسلم کو ناز تھا، اور سب سے زیادہ ناز آپ کو امام بخاریؒ پر تھا۔ اور امام مسلمؒ حضرت امام بخاریؒ کو "یا سید المحدثین" کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ اس لیے امام دار قطنی فرماتے ہیں۔

لولا البخاری لما جاء مسلم ولا راح ما ذکر

امام بخاریؒ کا فیض صحبت نہ ہوتا۔ تو امام مسلمؒ کا کوئی نام نہ لیتا۔[2]

**تلامذہ** تلامذہ کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا ہے۔ مشہور تلامذہ یہ ہیں۔

ابو حاتم رازی، ابو عیسیٰ ترمذی، ابوبکر بن خزیمہ، یحییٰ بن ساعد، ابو عوانہ، آپ کے یہ تلامذہ اپنے وقت کے محدث اور ائمہ فن تھے۔

**اخلاق و عادات زہد و تقویٰ** پوری زندگی میں نہ کسی کی غیبت کی، اور نہ ضرب و شتم کیا۔[3] امام صاحب اپنے اساتذہ و شیوخ کا بے حد احترام کرتے تھے۔ خاص کر اپنے شیخ حضرت امام محمد بن اسمٰعیل بخاریؒ کے تبحر علمی اور زہد و تقویٰ سے بے حد متاثر تھے۔ اور اپنے استاد کے خلاف کسی قسم کی بات سننا پسند نہیں کرتے تھے۔ جیسا کہ ایک واقعہ ہے کہ جب امام بخاری پر حاسدین نے خلق قرآن کا الزام لگایا، اور امام ذہلی نے اپنی مجلس میں فرمایا۔

الا من کان یقول بقول البخاری فی مسئلہ اللفظ بالقرآن مجلسنا۔

اس اعلان کو سن کر امام مسلم فوراً مجلس سے اٹھے اور ان سے مسموعہ روایات کے تمام مسودے ان کو واپس کر دیے اور امام ذہلی سے بالکلیہ روایت کرنا ترک کر دیا۔[4]

امام صاحب نہایت پاکیزہ، خوددار اور انصاف پسند تھے۔

---

[1] البدایہ والنہایہ جلد ۱۱ ص ۳۵

[2] سیرۃ البخاری ص ۱۴۰

[3] تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ ص ۶۵

[4] البدایہ والنہایہ جلد ۱۱ ص ۲۳۴

**امام صاحب کا مسلک** امام مسلم کے مسلک کی تعیین میں بڑی دشواری ہے۔ علامہ سید انور شاہ صاحب کشمیری (م ۱۳۵۲ھ) فرماتے ہیں۔

کہ امام مسلم و ابن ماجہ کا مذہب معلوم نہیں ہے۔ چونکہ صحیح مسلم کے ابواب مؤلف نے بذاتِ خود قائم نہیں کئے ہیں۔ اس لیے اُن کے مذہب کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔[۱]

السید نواب صدیق حسن رئیس بھوپال (م ۱۳۰۷ھ) فرماتے ہیں:-

کہ امام مسلم شافعی المسلک تھے[۲]

اور صاحب کشف الظنون نے بھی آپ کو شافعی لکھا ہے۔[۳]

**تصنیفات** الجامع الصحیح المسلم۔ مسند الکبیر الاسماء والکنی۔ جامع الکبیر۔ کتاب العلل۔ کتاب التمیز۔ کتاب الوحدان۔ کتاب الاقران۔ کتاب سوالات احمد۔ کتاب حدیث عمرو بن شعیب کتاب الانتفاع باہب السباع۔ کتاب مشائخ مالک۔ کتاب الشوریٰ۔ شعبہ۔ کتاب من لیس لہ الارا و واحد۔ ۔کتاب اولاد الصحابہ۔ کتاب اوہام المحدثین کتاب الطبقات۔ کتاب افراد الشامیین۔ کتاب رواۃ الاعتبار۔[۴]

**الجامع الصحیح المسلم کا تعارف** احادیث کے ذخیرہ میں سب سے پہلے امام بخاریؒ نے احادیث صحیحہ مرفوعہ کو الگ منتخب فرمایا۔ اور اپنی جامع الصحیح کو تیار کیا۔ اُس کو دیکھ کر امام مسلم کو بھی شوق ہوا کہ وہ بھی اسی انداز سے ایک جامع الصحیح تیار کریں۔ اس لیے کہ جب استاد نے ایک بہترین کام کیا تو استاد کے نقشِ قدم پہ چلتے ہوئے شاگرد کو بھی ایسا کرنا چاہیے۔ چنانچہ امام مسلم نے الجامع البخاری کی طرح الجامع الصحیح المسلم تصنیف کی۔

---

۱۔ فیض الباری جلد ۱ ص ۱۸۳

۲۔ الحطہ ص ۹۸

۳۔ محدثین عظام اور اُن کے علمی کارنامے۔ ص ۱۵۵

۴۔ مقدمہ فتح الملہم ص ۱۰۰

مسلم کی تصنیف کے سلسلہ میں مولانا تقی الدین ندوی فرماتے ہیں :-

" امام بخاریؒ کے پیش نظر احادیثِ صحیحہ مرفوعہ کی تخریج اور فقہ و سیرت و تفسیر وغیرہ کا استنباط ہے - اس لیے انہوں نے موقوف و معلق صحابہ و تابعین کے فتاویٰ وغیرہ بھی نقل کئے ہیں - اس مقصد کے پیش نظر احادیث کے متون و طرق کے ٹکڑوں کو اپنی کتاب میں بکھیر دیا ہے اور امام مسلم کا مقصد اعظم فقط احادیث صحیحہ کو منتخب کرنا ہے - وہ استنباط وغیرہ سے تعرض نہیں کرتے - بلکہ یہ حدیث کے مختلف طرق کو حسنِ ترتیب سے یکجا ہی بیان کرتے ہیں - جس سے متون کے اختلاف اور مختلف اسانید سے واقفیت حاصل ہوتی ہے - اِس لیے احادیث منقطع وغیرہ کی تعداد شاذ و نادر ہے"[1]

**تعداد روایات** امام صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے تین لاکھ احادیث سے ایک مسند صحیح کا انتخاب کیا ہے[2] اور اگر اس سے مکررات حذف کر لی جائیں تو اُن کی تعداد چار ہزار رہ جاتی ہے[3]۔

**زمانہ تصنیف** امام صاحب نے اپنی یہ گرانقدر علمی کتاب پندرہ سال میں مکمل کی[4]

**مقدمہ صحیح مسلم** امام صاحب نے اپنی اس مایہ ناز کتاب (صحیح مسلم) کا ایک مقدمہ بھی لکھا ہے۔

اس مقدمہ میں کیا ہے ؟ مولانا عبدالسلام مبارک پوری (م ۱۳۴۲ھ) لکھتے ہیں :-

" اس مقدمہ میں وجہ تالیف کے علاوہ فنِ روایت کے بہت سے فوائد اور اصول بیان کیے ہیں - جیسے رواۃ کی تقسیم اور اُن کے مدارج متفاوتہ (جن میں نہایت دقیق فرق ہے) کی توضیح ، رواۃ میں واقعی اور سچی جرح ہو تو بلا تردد بیان کر دینا چاہیے ، اور بیان کرنا جائز ہے - اِسناد دینی امر ہے - اور روایت میں نہایت تشدد سے کام لینا چاہیے - بلا تحقیق روایت لینے کی ممانعت ہے - ضعفاء سے روایت میں بڑی احتیاط برتنی چاہیے - معنعن روایت بشرط معاصرت راوی مروی عنہ مقبول ہے - لقا

[1] محدثین عظام اور اُن کے علمی کارنامے ص ۱۵۷ -

[2] مقدمہ نووی ص ۱۳ [3] مقدمہ فتح ملہم

[4] مقدمہ نووی -

کا ثبوت شرط نہیں۔ روایت یا معنی کی بحث، ان اصول کو امام مسلم نے نہایت مفصل اور مدلل بیان کیا ہے۔ اور بعض ان باتوں کا رد بھی کیا ہے جو اُن کے مسلک کے خلاف تھیں۔ یہ اصول مسائل چونکہ نہایت مہتم بالشان ہیں۔ اور ساتھ ہی اُس کے مقدمہ کی عبارت نہایت مغلق واقع ہوئی ہے۔ جس کا اغلاق مشہور ہے۔ اس وجہ سے کہ امام مسلم نے بلا تہذیب و تحریر بطریق متقدمین بلا تکلف اپنے مقصود کا اظہار فرمایا ہے۔ تکرار حمل کا خیال مانع ہوا نہ ایجاد فعل کا لحاظ فرمایا۔ کہیں مبتداء اول کر جملہ معترضہ کی طویل عبارت کے بعد خبر لاتے ہیں، کہیں صلات اور متعلقات کی تقدیم تاخیر بے ڈھب ہے۔ غرض کیف ما اتفق اپنے مقاصد کا اظہار فرمایا ہے۔ اور بعض اصول مسائل میں خلاف کیا ہے۔ اور اس کی مثال دینے میں بڑی طوالت سے کام لیا ہے[1]

**صحاح ستہ میں صحیح مسلم کا مقام**

صحاح ستہ میں صحیح مسلم کا کیا مقام ہے۔

امام نووی فرماتے ہیں۔ کتاب اللہ العزیز کے بعد صحیحین بخاری و مسلم کا مرتبہ اور امت نے ان دونوں کتابوں کی تلقی بالقبول کی ہے۔ البتہ صحیح بخاری اور دیگر فوائد و معارف کے لحاظ سے سب سے فائق و ممتاز ہے[2]۔

علامہ جزری فرماتے ہیں۔ یعنی صحیح بخاری کا امام مسلم کی کتاب پر من حیث المجموع راجح و مقدم ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جس کا اعتراف بڑے بڑے ناقدین فن نے بحث و غور و فکر کے بعد کیا ہے۔ پس اسی سے معلوم ہوا کہ صحیح بخاری کے بعد دوسرے درجہ پر صحیح مسلم کو رکھا گیا ہے[3]۔

محی السنۃ والاجاہ حضرت نواب صدیق حسن خاں رئیس بھوپال (م ۱۳۰۷ھ) تحریر فرماتے ہیں:

"واقع است اجماع بر تلقی ایں ہر دو کتاب بالقبول والتسلیم زیرا کہ شخصیت مقدم اند بر ائمہ عصر خود و عصر ما بعد در معرفت علل و غوامض ایں"[4]

یعنی صحیح بخاری و مسلم کی صحت پر تلقی بالقبول اور تسلیم عام حاصل ہے۔ کیونکہ

---

[1] سیرۃ البخاری ص ۴۱۳
[2] مقدمہ نووی ص ۱۴
[3] مقدمہ فتح الملہم ص ۹۶
[4] اتحاف ص ۴۸

امام بخاری و امام مسلمؒ اپنے زمانے اور مابعد کے ائمہ پر احادیث کے علل اور اس کی باریکیوں کی معرفت و تمیز میں سب پر مقدم و فائق تھے۔

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں :-

حسنِ ترتیب وغیرہ کے لحاظ سے اس کا مقام بہت بلند ہے۔ یہاں تک کہ بعض لوگوں نے اسے صحیح بخاری پر بھی اچھالا ہے[1]

اس لیے کہ امام بخاری کی تبویب نہایت علمی اور دقیق ہے۔ بخلاف صحیح مسلم کے کہ اس کے ابواب میں ایک نوع کی سہولت و تیسر ہے۔ امام بخاری استدلال کے لیے مختلف حدیثوں کو اتنے مختلف ابواب کے تحت لاتے ہیں کہ مناسبت کا معلوم کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ امام مسلمؒ ایسا نہیں کرتے، اُن کے ہاں ایک باب کے تحت حدیث کے تمام طرق آجاتے ہیں۔

صحیح مسلم کی یہ خصوصیت بھی ہے کہ اس میں موقوفات کو استدلال کے لیے نہیں پیش کیا جاتا اور اگر کہیں موقوف کا تذکرہ کیا بھی ہے، تو اصالۃً نہیں بلکہ تبعاً۔

غرض یہ کہ حسنِ وضع، جودت ترتیب اور تناول و استفادہ کے اعتبار سے صحیح مسلم کو ترجیح حاصل ہے۔ اسی بناء پر دارقطنی کو اپنی تاریخ میں اس کا اقرار کرنا پڑا۔

لم یصنع احدٌ مثلہٗ

کہ اور کسی کو وضع و ترتیب کا یہ سلیقہ ارزانی نہیں ہوا۔

امام ابن حزم بھی انہیں وجوہ کے پیش نظر صحیح مسلم کی فضیلت کے قائل تھے۔

**الجامع الصحیح المسلم کی شروح**

صحیح مسلم پر بہت سی شروح و حواشی اور مستخرجات لکھے گئے ہیں۔ صاحبِ کشف الظنون نے اس کا مفصل تذکرہ کیا ہے۔ مولانا عبدالسلامؒ مبارک پوری نے بھی صحیح مسلم کی شروح کی ایک مفصل فہرست لکھی ہے[2]

ہم چند ایک مشہور شروح کا تذکرہ پیش کرتے ہیں :-

---

[1] فتح الملہم ص ۹۹

[2] سیرۃ البخاری ص ۴۱۵ تا ۴۲۱

۱- صحیح مسلم کی مشہور شرح امام نووی کی شرح ہے۔

اس شرح کا پورا نام المنہاج فی شرح صحیح مسلم بن حجاج ہے۔ اور مصنف کا نام حافظ ابوزکریا یحییٰ بن شرف النووی الشافعی (م ۶۷۶ھ) ہے۔

امام نووی اس شرح کے بارے میں فرماتے ہیں:

"اگر لوگوں کی ہمتیں پست نہ ہوتیں تو میں اس شرح کو ایک سو جلدوں میں مکمل کرتا۔ لیکن تین جلدوں میں ختم کر دیا۔ اس شرح کے شروع میں ایک مقدمہ طالبین حدیث کے لیے نہایت مفید ہے[۱]

۲- الدیباج علی صحیح مسلم بن الحجاج - علامہ جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ھ)

ایک عمدہ شرح ہے۔ اس کا آغاز بحمد اللہ الذی سلک باصحاب الحدیث اوضح نہجۃ ہے۔ ابتدا میں چند فصلیں ہیں جن میں صحیح مسلم کے شروط، ان کی اصطلاحات اور کنیتوں والقاب و اسما میں جو اشتباہ واضح ہو سکتا تھا۔ اس کا رفع کیا ہے۔ الفاظ غریبہ و اعراب مشکلہ کا حل، تناقضات کا رفع، اختلافات روایات کا بیان اوہام کا ایضاح، غرض استنباط مسائل کی ساری باتیں موجود ہیں[۲]

۳- السراج الوہاج فی شرح مختصر صحیح مسلم بن الحجاج - از السید نواب صدیق خاں رئیس بھوپال (م ۱۳۰۷ھ)

یہ شرح دو جلدوں میں ہے۔ اور مسلم کی حامل متن شرح بحذف اسناد اور تبویب امام نووی کے بجائے شارح کی تبویب کے ساتھ[۳]

۴- فتح الملہم فی شرح صحیح المسلم از مولانا شبیر احمد عثمانی (م ۱۳۶۹ھ) ۵ جلدیں۔ اس کی تین جلدیں شائع ہوئی ہیں۔ افسوس کہ باقی کی تکمیل نہ ہو سکی[۴]

---

[۱] سیرۃ البخاری ص ۴۱۵ [۲] ایضاً ص ۴۱۸

[۳] ہندوستان میں اہل حدیث کی علمی خدمات ص ۴۳

[۴] دارالعلوم دیوبند نمبر ص ۱۵۵

متن کا حل اکثر و بیشتر شرح مسلم للنووی سے ماخوذ ہے۔ اور سند و اختلاف روایات سے متعلق مباحث فتح الباری وغیرہ سے لیے گئے ہیں[۱]۔

۵۔ ترجمہ صحیح مسلم اُردو۔ از مولانا وحید الزمان (م ۱۳۳۸ھ)

اُردو میں شرح شاید ہی اس سے زیادہ کوئی اور مفصل شائع ہوئی ہو[۲]۔

۶۔ ترجمہ انگریزی صحیح مسلم۔ از عبدالحمید صدیقیؒ مدیر ترجمان القرآن (م ۱۹۷۸ء)

عبدالحمید صدیقی مرحوم نے انگریزی میں صحیح مسلم کا مکمل ترجمہ و تشریح کی ہے۔ یہ مکمل ترجمہ و تشریح شیخ محمد اشرفؒ تاجر کتب لاہور نے شائع کیا ہے۔

ترجمہ انگریزی کے علاوہ اُردو میں بھی پروفیسر صاحب مرحوم نے ترجمہ و تشریح کی ہے — جو رحمان پبلشنگ کمپنی اچھرہ لاہور کے زیر اہتمام شائع ہو رہا ہے۔ یہ ترجمہ ۱۶ مجلدات میں شائع ہوگا۔ اب تک اس کی دو جلد شائع ہو چکی ہیں۔

**شروح مقدمہ صحیح مسلم** امام مسلمؒ نے صحیح مسلم کا جو مقدمہ لکھا ہے اس کے بھی شروح و حواشی علمائے کرام نے لکھے ہیں۔ چند ایک شروح و حواشی درج ذیل ہیں:

۱۔ البحر المواج۔ از استاذ الاساتذہ مولانا حافظ عبداللہ صاحب غازی پوری (م ۱۳۳۷ھ)

یہ طویل اور نہایت مفید شرح ہے۔ افسوس کہ ابھی تک طبع نہیں ہو سکی۔

۲۔ البحر الوہاج شرح مقدمۃ الصحیح المسلم بن الحجاج۔ از علامہ شمس الحق ، (م ۱۳۲۹ھ)

یہ ایک علمی شرح ہے، اور نہایت طویل شرح ہے۔ افسوس کہ یہ شرح بھی ابھی تک طبع نہیں ہو سکی[۳]۔

۳۔ مقدمہ فتح الملہم۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اپنی شرح مسلم کے شروع میں ایک مقدمہ بھی لکھا ہے۔ یہ ایک مطول مقدمہ ہے جس میں بعض مفید نقول مذکور ہیں[۴] اور اس کے ساتھ علم حدیث کے اصول و ضوابط

---

[۱] سیرۃ البخاری ص ۴۲۱

[۲] ہندوستان میں اہل حدیث کی علمی خدمات۔ ص ۴۴

[۳] سیرۃ البخاری ص ۴۱۴ و ہندوستان میں اہل حدیث کی علمی خدمات ص ۴۳۔ [۴] سیرۃ البخاری ص ۴۳۱

اور کتاب کی خصوصیات سے بحث کی ہے۔[1]

**امام مسلم کی وفات** امام صاحب کی پوری زندگی میں ان کی وفات کا واقعہ نہایت حیرت انگیز اور عبرت خیز ہے۔ خصوصاً اس سے امام صاحب کی علمی شیفتگی وانہماک کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کہا گیا ہے کہ مجلس درس میں ایک حدیث کے متعلق دریافت کیا گیا۔ جو امام صاحب کو سوءِ اتفاق سے یاد نہ آئی۔ اور پھر گھر واپس آئے تو انہیں ایک خرمے کی تھیلی پیش کی گئی۔ حدیث کی تلاش وجستجو میں اس قدر محو ہوئے کہ چھوہارے آہستہ آہستہ سب کھا گئے اور حدیث بھی مل گئی۔ یہی امام صاحب کی موت کا سبب ہوا۔

امام صاحب کا انتقال ۵۵ برس کی عمر میں نیشاپور میں ہوا۔ اور نیشاپور کے قریب نصیرآباد میں دفن کیے گئے۔[2]

إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

---

[1] محدثین عظام اور ان کے علمی کارنامے ص ۱۸۰

[2] ابن خلکان جلد ۲ ص ۱۳۶

مغربی تہذیب کا بحران

# یورپ ——— ایک وسیع پاگل خانہ

جناب ریاض الحسن نوری صاحب

(۲)

**مغرب میں محرمات سے بدکاری** یورپ میں محرمات سے بدکاری عام خیال سے کہیں زیادہ ہے۔ اعداد و شمار سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ ایک تو جدید دور کی عریانی اور فحاشی ہے مگر اس میں مغرب کی بگڑی ہوئی عیسائیت کا بھی کافی ہاتھ ہے۔ قرون وسطیٰ کے پوپوں اور پادریوں میں یہ عیب بہت زیادہ تھا۔ اسی وجہ سے ان پادریوں نے بائیبل تک میں تحریف کر ڈالی۔ یورپین مصنفین کی کتابوں میں ہمیں کئی پوپوں پر محرمات سے ناجائز تعلقات کے الزامات ملتے ہیں۔

Lecky کے حوالے سے برٹرینڈ رسل لکھتا ہے:

The writers of the middle ages are full of accounts of nunneries that were like brothels ...... that inverterate prevalence of incest among the clergy..........

یعنی قرونِ وسطیٰ کے مصنفین کی تصنیفات ایسے بیانات سے بھری پڑی ہیں جن میں کہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ ننوں کی رہائش گاہیں قحبہ خانے بنے ہوتے تھے جہاں کہ ناجائز بچوں کو بھاری تعداد میں مار ڈالا جاتا تھا۔ مزید یہ کہ پادریوں میں محرمات سے بدکاری اس قدر عام اور عادی روایات بن چکی تھی کہ بار بار سخت قوانین کے ذریعے پادری حضرات پر یہ پابندی لگائی جاتی رہی کہ وہ اپنی ماں بہنوں کے ساتھ رہائش اختیار نہ کرنے پائیں...... ریفارمیشن سے پہلے یہ شکایتیں عام اور پرزور طریقوں سے آتی رہتی تھیں کہ گناہوں سے معافی ( Confessionals ) کو بدکاری

کے ذریعے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔[1]

بینجمن اور ماسٹرز لکھتے ہیں کہ امریکہ میں یورپین مردوں اور افریقی عورتوں کے تعلقات کے نتیجے میں محرمات سے بدکاری بہت عام ہوگئی۔ کیونکہ لونڈیوں کے مالک ان سے ہونے والی اپنی ہی صلبی اولاد سے اس کے بدلتے ہوئے رنگِ بدن کی وجہ سے لطف اندوز ہونا چاہتے تھے۔ ریکارڈ پر ایک اسّی سال کے پیٹے میں پہنچے ہوئے "جنٹلمین" کا واقعہ موجود ہے جس نے اپنی ہی اولاد در اولاد سے پانچ نسلوں تک جنسی تعلقات قائم کیے۔ یعنی اپنی بیٹی، پھر اس سے جو بیٹی پیدا ہوئی۔ پھر اس کی بیٹی سے جو بیٹی پیدا ہوئی۔ پھر آگے اُس کی بیٹی، اور یہ سب کی سب اپنے ہی صلب سے۔ بعد ازاں اس کی نظر اپنی ہی پوتی کی پوتی کی بیٹی پر بھی جواب پر وان چڑھ رہی تھی۔[2]

محرمات سے بدکاری کی ایسی مثال کسی بھی ایشیائی ملک یا قوم میں ڈھونڈے سے بھی نہیں مل سکتی۔ یہ محض مغربی تہذیب ہی کا طرۂ امتیاز ہے۔

**بدکاری بطور ایک مہذبانہ فیشن کے**

مشرقی عوام یہ سمجھتے ہیں کہ یورپ میں عام بدکاری اور محرمات سے بدکاری کوئی ماڈرن چیز ہے۔ ایسا ہرگز نہیں۔ جس جنسی آزادی یا بے راہ روی کو ہمارے لوگ ماڈرن سمجھ کر اپنانا چاہتے ہیں۔ یہ تو یورپ کا دقیانوسی رواج ہے جس کا علم ہم کو اب ہوا ہے۔

G. Rattray Taylov اپنی مشہور کتاب ہسٹری آف سیکس میں قرونِ وسطیٰ کی جنسی تاریخ کے باب (باب دوم) میں یوں لکھتا ہے:۔

یعنی ہمارے دَور کے پہلے ہزار سالہ عرصے کے دوران انگریزوں کی جنسی زندگی کا خاصہ جبری بدکاری اور محرمات سے ملوث ہونا تھا۔ اور اُس کے بعد کے دَور میں سدومیت Sadomy کا ہٹر یا پھیل گیا...... قرونِ وسطیٰ کا یورپ ایک عظیم پاگل خانے کا مثل ہوگیا..... مذہبی عبادت گاہیں اکثر جنسی غلاظت کے اڈے بن گئے۔

---

[1] Worlds Greatest Scandles P. 171

[2] P. 44 Marriage and Morals by Bertrand Russell.

[3] PP. 64 The Prostitute in Society.

آٹھویں صدی میں Boniface لکھتا ہے کہ انگریز قوم شادی سے سخت نفرت کرتی ہے۔ MATRIMONY Utterly despise اور لوگ جائز بیویاں رکھنے سے بالکل انکار کرتے ہیں اور ہنہناتے گھوڑوں اور ڈھینچوں ڈھینچوں کرتے گدھوں کی مانند جنسی بے راہ روی کی زندگی گذارتے ہیں ...... اس کے سو سال بعد Alcuin اعلان کرتا ہے کہ ملک بدکاری، شادی شدہ عورتوں سے بدکاری اور محرمات کی بے احترامی کے طوفان میں بالکل ڈوب چکا ہے اور شرم و حیا بالکل ناپید ہیں۔

اس کے تین صدیوں بعد John آف سالسبری اپنے خیالات یوں نظم میں بیان کرتا ہے۔

Thys is now a common synne
for almost hyt is every-whore
Agentyle man hath a wife and a hore,
and wives have now comunly
Here husbandys and a ludby

چوسر کے صفحات سے واضح ہو جاتا ہے کہ چودھویں صدی عیسوی میں بھی ایسی بیویاں بہت تھیں Such as wife of Bath جو بغیر کسی پس و پیش کے غلیظ گناہ کے موقع کے لیے تیار رہتی تھیں۔ مرد چھوٹے کوٹ پہنتے تھے اور زیریں لباس میں اہتمام تھا کہ اعضائے اسفل نمایاں رہیں۔ اس غرض کے لیے مروج مخفیلے نما لباس کا نام Breguette تھا۔ کاڈپیس Codpiece اس کے مقابلے میں پھر بھی زیادہ باحیا لباس ہے۔

آخر کار ایڈورڈ چہارم کے دور میں کامنز نے یہ درخواست پیش کی کہ کسی نائٹ وغیرہ کو ایسے لباس کی اجازت نہ ہونی چاہیے۔ ان کا کوٹ اتنا لمبا ہونا چاہیے کہ جس سے سامنے کا حصہ اور پیچھے کے حصے Buttokks مستور ہوں۔ البتہ بہت بڑے لوگ یعنی اسٹیٹ آف اے لارڈ یا اس سے بڑے لوگ جیسا لباس پسند کریں پہن سکتے ہیں۔ اس دور فساد میں پادریوں نے بھی اپنے کوٹ گھٹنوں تک چھوٹے

---

لے گویا جدید دور کے جو ماڈرن حضرات شادی کے خلاف ہیں وہ درحقیقت ماڈرن نہیں بلکہ رجعت پسند ہیں اور قرونِ وسطیٰ کی طرف رجعت کرنا چاہتے ہیں۔

کر لیے اور اس سے اگلی صدی میں کوٹ اتنے مختصر بنا لیے کہ جو ان کے درمیانی جسم کو نہ ڈھانکتے تھے۔

کروسیڈ کے بعد حماموں کا رواج ہو گیا جو قحبہ خانوں میں تبدیل ہو گئے۔ ونچسٹر کے بشپ کے ماتحت بہت سے ایسے قحبہ خانے چلتے تھے۔ اسی سے انگریزی زبان کا محاورہ Winchester Geese بنا ہے۔ کم از کم ایک انگریز کارڈینل نے چرچ کی طرف سے سرمایہ کاری کے طور پر ایک قحبہ خانہ خریدا تھا[1]......

لیکن شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ ایک قسم کی سادگی بھی چلتی تھی۔ مرد اور عورتیں بالکل عریاں یا تقریباً عریاں حالت میں اس طرح سے سڑکوں پر سے گزر کر حماموں کا رُخ کرتے جو کہ آج سوائے نہانے کے مقام کے ناممکن ہے...... شرفاء کی لڑکیاں شاہ چارلس پنجم کے سامنے عریاں پریڈ کرنے کو باعثِ عزت خیال کرتی تھیں۔

...... آج کل کنگ آرتھر کے نائٹوں کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ شرافت اور بہادری کے پیکر تھے مگر حقیقت اس کے بالکل اُلٹ ہے۔ عیسائی مؤرخ Gildas ان کے متعلق لکھتا ہے کہ یہ نائٹ شیخی باز، قاتل، بدکاریوں اور برائیوں میں ملوث اور خدا کے دشمن ہوتے تھے — بہت سی بیویاں رکھنے کے باوجود وہ بہت سی شادی شدہ اور غیر شادی شدہ عورتوں سے تعلقات گناہ استوار کرتے۔ لیڈیوں کے اخلاق بھی کچھ بہتر نہ تھے۔ کنگ آرتھر کے دربار میں جب ایک ایسی جادو کی انگوٹھی پیش کی گئی جسے صرف کوئی باعصمت عورت ہی پہن سکتی تھی تو دربار کی ایک بھی لیڈی اس کو پہننے کے لیے تیار نہ تھی۔

اصول یہ تھا کہ کوئی عورت اگر ایک نائٹ کو دوسرے نائٹ کے ہمراہ مل جائے تو پہلا نائٹ اگر چاہے تو دوسرے نائٹ سے لڑ کر اس عورت کو حاصل کر سکتا ہے۔ اور اس عورت سے جو چاہے کر سکتا ہے۔ اس طریقے سے حاصل کرنے پر اس پہ کوئی حرف نہیں آسکتا۔

اور Trail Man کہتے ہیں کہ اس دور کی نظموں اور عشقیہ واقعات سے واضح ہو جاتا ہے کہ کسی

---

[1] یاد رہے کہ ملکہ وکٹوریہ کے دور کے انگریز شرفاء کی قحبہ خانوں میں سرمایہ کاری عام تھی۔

Worlds Greates Scandals P. 33
by Charls Franklin.

اکیلی عورت کو دیکھ کر کبھی ہر نائٹ کے دل میں پہلا خیال جو آتا تھا وہ یہ ہوتا کہ اس بے یار و مددگار عورت کے ساتھ زیادتی کیسے کی جائے۔ Gawain جو نائٹ ہڈ اور شرافت و اخلاق کا مثالی نمونہ خیال کیا جاتا تھا۔ اُس نے Grande Lis سے زنا بالجبر کیا۔ کیونکہ اُس نے انکار کر دیا تھا۔ اس پیکر شجاعت نے اُس کے آنسوؤں اور چیخ و پکار کی کوئی پروا نہ کی۔ Malory کا بیان ہے کہ جب ایک نائٹ کنگ آرتھر کے دربار میں داخل ہوا اور ایک چیختی چلاتی اور زار و قطار روتی عورت کو زبردستی اُٹھا کر لے گیا تو بادشاہ خوش ہو گیا۔ کیونکہ وہ بہت شور مچا رہی تھی[۱]......

......وہ نائٹ جو Chetelaine آف Couci سے محبت کرتا ہے۔ وہ شادی کے بجائے محض یہ کہتا ہے: Jesus[۲] بس میں یہ چاہتا ہوں کہ اس کا بے لباس جسم میرے بازوؤں میں ہو۔ غرض کہ شادی محض ایک وقتی چیز سمجھی جاتی تھی اور کسی بہادری کے کام پر بادشاہ کی لڑکی کے ہاتھ کا وعدہ بھی کوئی بندھن کا وعدہ نہ ہوتا تھا...... کسی عورت کا اپنی عصمت کو کسی نائٹ کے سامنے پیش کرنا قابل تعریف فعل سمجھا جاتا تھا۔ Gowain اپنی معشوقہ کے اچھے ذوق کی اس بنا پر تعریف کرتا ہے کہ اُس نے اپنے آپ کو سرخ نائٹ جیسے بہادر جنگجو کو پیش کیا۔ (گویا جو شے باعثِ قدح تھی، وہ وجہ مدح بن گئی)...... ایک اور داستانِ محبت میں جب خاوند اپنی بیوی کی بے وفائی پر لعن طعن کرتا ہے تو بیوی کہتی ہے۔ مائی لارڈ! اس سے آپ کی عزت پر کوئی حرف نہیں آیا۔ کیونکہ میں نے جس شخص سے معاشقہ کیا ہے وہ ایک بیرن ہے، جو ہتھیاروں کے استعمال کا ماہر ہے، اس کا نام Roland ہے اور وہ شاہ چارلس کا بھتیجا ہے۔

---

[۱] نپولین کے فوجیوں کو خود اپنی قوم کی لڑکیوں کو سڑک پر سے اُٹھا کر حیوانی جبر کی اجازت تھی اور خود نپولین کا لڑکیوں کو اغوا کرانا بھی اسی قدیم رواج پر عمل تھا۔

[۲] غرضیکہ جس طرح قرون قدیم اور وسطیٰ کے نام نہاد عیسائی اپنے مذہبی اخلاق کو پسِ پشت ڈال دیا کرتے تھے۔ اسی طرح کی پیروی میں بیسویں صدی کی انگلینڈ کی پارلیمنٹ نے قحبہ گری اور ساڈومیت کو بالآخر جائز قرار دے دیا۔ یہ بھی دراصل رجعت پسندی ہی ہے، ابھی نہیں ہے۔

خاوند یہ سن کر خاموش ہو جاتا ہے۔
یاد رہے کہ نائٹ طبقے کا ان طریقوں سے مقصد فی الحقیقت عیسائی قوانین کی مخالفت کرنا یا اخلاق کو خیر باد کہنا نہیں تھا، بلکہ وہ تو اپنے انہی رسم و رواج کو جاری رکھے ہوئے تھے جو عیسائی مشنریوں کے آنے سے پہلے وہاں رائج تھے اور ان کے آنے کے بعد بھی بہت سی صدیوں تک ان کا سکہ چلتا رہا۔
بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ رسمی شریعت مذہب عیسائیت پر غالب آگئی اور اس کا غلبہ آج بھی برقرار ہے۔ عیسائی دور کی پہلی چند صدیوں کے حالات پر آئرلینڈ کے لٹریچر سے روشنی پڑتی ہے اور پتہ چلتا ہے کہ کنوارپن کی کوئی قدر نہ تھی۔ شادی ایک دفع الوقتی کا انتظام ہوتا تھا۔ ملکہ Medb اپنے خاوند کو فخریہ انداز میں بتاتی ہے کہ شادی سے پہلے اس کے دوہرے سلسلہ ہائے عشق چل رہے تھے۔ Conchobar شاہ Sualdam کی بہن Dechtin سے یہ جانتے ہوئے بھی شادی کر لیتا ہے کہ وہ کسی اور سے ملوث ہے۔ جب شہزادی Findabair اپنی ماں سے کہتی ہے کہ اسے تو مخالف کیمپ کا بھیجا ہوا پیامی بڑا بھلا لگتا ہے تو ملکہ جواب میں کہتی ہے کہ اگر تم اسے پسند کرتی ہو تو آج رات اس کے ساتھ بسر کرو[1]۔
Chivalry کے دور سے بھی زیادہ اس دور میں شادی کو محض وقتی معاملہ سمجھا جاتا تھا۔ قرونِ وسطیٰ کے آخری دور تک بار بار بیویاں بدلنا عام تھا۔ اسی سے ہنری ہشتم کے شادیوں کے تجربات کو سمجھا جا سکتا ہے۔ Dunham زور شور سے دعویٰ کرتا ہے کہ فرینکش بادشاہ اکثر ان خرابیوں میں پڑ کر صحت برباد کر کے تیس سال کی عمر سے پہلے ہی مر جایا کرتے تھے۔
قدیم مغربی معاشرے میں عریانیت میں کوئی شرم محسوس نہ کی جاتی تھی۔ نہ صرف یہ کہ جنگی بہادر رسوائے عین جنگ کے، عام طور سے عریاں رہتے تھے، بلکہ عورتیں بھی آزادی سے کپڑے اتار دیا کرتی تھیں—
پس جب Ulster کی ملکہ اور دربار کی تمام عورتیں جن کی تعداد ۶۱۰ تھی Cuchulainn کے استقبال کو گئیں تو کمر سے اوپر بالکل عریاں تھیں۔ پھر اس کے سامنے آکر سکرٹوں کو اٹھا کر بدن کے خفیہ حصوں کو بھی ظاہر کر دیا۔ اس طریقے سے وہ آن کو بتانا چاہتی تھیں کہ وہ اس کی کتنی عزت کرتی ہیں—

(باقی)

---

[1] ذرا خیال کیجیے، خدا کے ایک پاک باز اور پاکبازی کی تعلیم دینے والے پیغمبر (علیہ السلام) کا نام کہاں کس مقصد سے استعمال ہو رہا ہے۔ مغرب نے تو اپنے تسلیم کردہ انبیاء سے بھی انصاف نہیں کیا۔ (دفتر۔ ص)

رسائل و مسائل

# وقف کی شرعی تعریف و احکام

ملک غلام علی صاحب

سوال :- ہمارے ہاں ایک سوال مد وقف کے بارے میں موصول ہوا تھا۔ اصل سوال تاحال اس وقت نہیں مل سکا، البتہ اس کے جواب کی نقل ریکارڈ میں موجود ہے۔ اس جواب سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں درج ذیل نوعیت کے سوالات دریافت کیے گئے ہوں گے۔

۱- وقف کی شرعی تعریف کیا ہے؟

۲- علمائے اُمت نے اس کے لیے کیا قواعد و ضوابط اور احکام مقرر فرمائے ہیں؟

۳- کوئی جائداد یا اس کی آمدنی کُلاً یا جزءً اگر فی سبیل اللہ خیراتی مقاصد میں صرف ہوتی رہی ہو تو کیا مجرد یہ امر اس جائداد کو شرعاً وقف کی تعریف میں داخل کر سکتا ہے جب کہ واقف کی جانب سے وقف کرنے کا کوئی دوسرا ثبوت موجود نہ ہو۔

۴- کسی کی مملوکہ جائداد یا املاک کو زبردستی وقف قرار دینا یا مغصوبہ جائداد کو وقف قرار دینا کہاں تک صحیح ہے؟ کیا کسی فرد یا حکومت کو اس طرح کا حق اسلام میں حاصل ہے؟

جواب :- وقف اسلامی شریعت میں ایک خاص اصطلاح ہے جس سے مُراد یہ ہے کہ کوئی مالک یا صاحبِ جائداد اپنی مِلک کو اپنی ملکیت سے خارج کر دے اور اُسے اللہ تعالیٰ کی مِلک قرار دے کر فی سبیل اللہ خیرات کر دے۔ اس طرح کی جائداد یا املاک کامل و سالم طور پر اپنی اصل حالت میں برقرار رہتی ہیں اور اُن کا نفع یا آمدن افراد و اشخاص یا مصارف میں تقسیم یا صرف

ہو نا رہتا ہے جس کو واقف مستحق قرار دے دیتا ہے۔ اس کا ذکر متعدد ارشادات نبوی میں ملتا ہے۔ جن میں سے ایک نہایت مستند حدیث یہاں نقل کی جاتی ہے۔

صحیح بخاری شریف، باب شروط فی الوقف (شرائط وقف) کی ایک حدیث کا ترجمہ درج ذیل ہے:

"حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو فتح خیبر کے بعد زمین ملی تو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس کے متعلق مشورہ حاصل کرنے کے لیے حاضر ہوئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ مجھے خیبر میں زمین ملی ہے جس سے بہتر زمین میرے پاس نہیں۔ آپؐ مجھے کیا حکم دیتے ہیں؟ آنحضورؐ نے فرمایا: اگر چاہو تو اصل کو وقف کر دو اور آمدنی کو صدقہ کر دو۔ حضرت عمرؓ نے اُسے وقف کر دیا کہ اصل جائداد نہ فروخت کی جاسکے، نہ ہبہ ہو سکے، نہ اُس میں وراثت جاری ہو (لَا یُبَاعُ وَلَا یُوْھَبُ وَلَا یُوْرَثُ)۔ اس کی پیداوار فقراء، رشتہ داروں، غلاموں کی رہائی، فی سبیل اللہ مدات، مسافروں اور اجنبی مہمانوں پر خرچ ہو۔ اس کے متولی پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ معروف طریقے پر خود بھی اس میں سے کھائے مگر متمول بننے کی کوشش نہ کرے"۔

صحیح بخاری کے ابواب شروط کے بعد، ابواب الوصایا آتے ہیں۔ اس میں یہ حدیث اس طرح مروی ہے:

"حضرت عمرؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں اپنا ایک باغ بطور صدقہ جاریہ کے وقف کیا۔ انھوں نے آنحضورؐ سے عرض کیا کہ میں نے ایک نفیس جائداد حاصل کی ہے اور میں اس کا صدقہ کرنا چاہتا ہوں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کا اصل (CORPUS) وقف کر دو۔ اسے نہ بیچا جائے گا، نہ بطور ہبہ دیا جائے گا اور نہ یہ وراثت میں کسی کو منتقل ہوگا (اس حدیث میں بالکل وہی لفظ دہرائے گئے ہیں کہ لا یباع، ولا یوھب ولا یورث) لیکن اس کے پھلوں کا صدقہ کیا جائے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے اس باغ کا صدقہ کر دیا اور اس کا صدقہ فی سبیل اللہ، غلاموں کو آزاد کرانے، مساکین، مہمانوں، مسافروں اور قرابت داروں میں بانٹا جاتا تھا"۔

اسی مضمون کی احادیث صحیح مسلم، ترمذی، نسائی اور حدیث کی دوسری کتابوں میں بھی مذکور ہیں
ان احادیث سے جو بنیادی اصول و احکام وقف سے متعلق مستنبط ہوتے ہیں اور جن پر پوری امت کے
فقہاء و علماء کا اتفاق و اجماع ہے۔ وہ درج ذیل ہیں:۔

۱۔ کسی جائداد کو اللہ کی راہ میں وقف کرنا اُس جائداد کے مالک کا حق ہے۔ کسی دوسرے فرد یا ادارے
یا حکمران کو یہ حق یا اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی ایسی جائداد کو وقف قرار دے جو کسی کی مملوکہ ہے ۔۔ نبی
صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول بھی تھے اور مسلمانوں کے امیر اور حکمران بھی تھے مگر جس جائداد کے متعلق خود حضرت
عمرؓ نے وقف کی پیش کش کی اُسے بھی اپنی تحویل اور قبضے میں لینے کے بجائے آپؐ نے حضرت عمرؓ ہی
کو اختیار دیا کہ تم چاہو تو اُسے وقف کر دو اور اُس کی آمد غربا اور مساکین وغیرہ میں تقسیم کرتے رہو۔

۲۔ جو جائداد واقف اپنی آزادانہ مرضی سے وقف کر دے، اس کا اصل جوں کا توں رہے گا، اس میں
خرید و فروخت، ہبہ، وراثت، تبادلہ کی قسم کے اس طرح کے تصرفات و انتقالات نہیں ہو سکتے جو عام
املاک میں ہوتے ہیں۔

۳۔ جو جائداد کسی شخص کی مِلک میں ہو، جب تک اُس کا ثبوت نہ مل سکے کہ اُس نے اپنے فعل سے اس
جائداد کو اپنی مِلک سے خارج کر کے فی سبیل اللہ وقف کر دیا ہے، بلکہ اس کے برعکس اس کا ثبوت موجود
ہو کہ شخص مذکور اس جائداد میں کامل مالکانہ اختیارات رکھتا ہے اور انہیں استعمال کرتا رہا ہے اور یہ
سارے اختیارات وراثۃً یا کسی دوسرے جائز طریق پر دوسروں کی جانب پورے کے پورے منتقل ہو
رہے ہیں تو یہ جائداد محض اس بناء پر وقف قرار نہیں دی جا سکتی کہ اس کی آمدنی کُلاً یا جزءً ان مقاصد میں
صرف ہو رہی ہے یا ہوتی رہی ہے جو مذکورہ بالا احادیث میں مقاصد وقف کے طور پر مذکور ہیں، نہ
اس جائداد کو کوئی حکومت یا اُس کا نامزد کردہ کوئی عہدہ دار اپنی مرضی یا صوابدید سے واقف قرار دے کر
اُسے مالک کی ملکیت سے نکال کر اپنے تصرف میں لے سکتا ہے۔

۴۔ وقف کے وجود میں آنے اور اس کے صحیح ہونے کے لیے ضروری ہے کہ جائداد موقوفہ واقف کی
بالفعل جائز ملکیت ہو۔ فقہاء نے تصریح کی ہے کہ اگر ملکیت حاصل ہونے سے پہلے کوئی شخص جائداد کو
وقف قرار دے اور ملکیت اُسے بعد میں حاصل ہو یا جائداد وہ شخص غصب کرلے اور اُسے وقف قرار دے
خواہ اُس کی قیمت مالک کو ادا کرے یا مالک سے مصالحت کر لے تب بھی اس جائداد کا وقف قرار دینا اس

غاصب یا خریدار کے لیے جائز نہ ہوگا اور یہ وقف صحیح نہ ہوگا کیونکہ وقف قرار دیتے وقت وہ اس جائداد کا جائز مالک نہ تھا۔

کتبِ فقہ سے بھی مذکورہ بالا مندرجات کی تصدیق ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر فتاویٰ عالمگیری کتاب الوقف میں منقول ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک وقف کی تعریف شرع میں یہ ہے کہ واقف عین جائداد کو اپنے پاس روک کر رکھے اور اس کی منفعت کو فقرا پر خیرات کرے اور امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک تعریف یہ ہے کہ عین جائداد کو اللہ کی ملک قرار دے کر وقف کرنے والا اپنے پاس رکھے اور اس کا نفع بندگانِ خدا کے لیے لوٹائے۔ تب یہ وقف لازم و صحیح ہوگا، نہ اُسے بیچا جائے گا نہ ہبہ کیا جائے گا نہ وراثت میں جائے گا۔

فتاویٰ عالمگیری میں شرائط وقف درج ہیں:۔

واقف عاقل ہو، بالغ ہو، وقف تقرب الٰہی کے لیے ہو (چنانچہ گرجا یا مندر وغیرہ کے لیے وقف صحیح نہ ہوگا)۔ پھر لکھتے ہیں: الملك وقت الوقف حتى لو غصب ارضا فوقفها ثم اشتراها من مالكها ودفع الثمن اليه او صالح على مال دفعه اليه لا تكون وقفا (وقف کے صحیح ہونے کی ایک شرط یہ ہے کہ جو وقف کر رہا ہے، بوقت وقف جائداد اس کی ملک میں ہو، اگر اُس نے کوئی زمین زبردستی غصب کر لی، اُسے وقف قرار دیا۔ پھر مالک سے خرید کر قیمت ادا کر دی یا کچھ معاوضے پر مصالحت کر لی تو یہ وقف نہیں ہوگا۔

اسلامی شریعت کا اصول یہ بھی ہے کہ وہ فرائض کی پابندی کو سختی سے کرانا چاہتی ہے اور اس کے لیے حکومتی اقتدار اور جبر و اکراہ کا استعمال بھی بعض اوقات کرتی ہے، مثلاً زکوٰۃ و عشر کی قانونی وصولی لازمی ہے مگر جہاں تک نفلی عبادات اور غیر واجب صدقات و خیرات کا تعلق ہے ان پر کسی مسلمان کو مجبور نہیں کیا جاتا تاکہ اس کے اندر رضاکارانہ طور پر اللہ کا تقرب حاصل کرنے کا جذبہ مُردہ نہ ہو جائے۔ وقف بھی ایک نفلی صدقہ کی صورت ہے۔ اگر اس کے لیے زبردستی املاک کا حصول کیا جائے تو یہ حصولِ ثواب کے بجائے ایک کارِ بے خیر بن کر رہ جائے گا اور وقف فی سبیل اللہ کا اصل مقصد فوت ہو کر رہ جائے گا۔

ان تصریحات سے یہ امر واضح ہے کہ جب تک جائداد کا مالک خود وقف کا اعلان و اقرار نہ کرے، یا فعل وقف کا مالک سے صادر ہونے کا ثبوت موجود نہ ہو کسی دوسرے فریق یا اتھارٹی کا ایسی جائداد کو وقف قرار دینا اور اسے اپنے قبضہ و تصرف میں لینا اسلامی شریعت کی نگاہ میں ایک بے جواز اقدام ہے جو بالکل باطل، کالعدم اور بے اثر ہے۔ ●

# مطبوعات

**ثانی ؓ لاثانی**
(منظوم مناقب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ)
شاعر : عبدالعزیز خالد
قیمت : دس روپے - ۵۲ صفحات مجلد
ملنے کا پتہ :
آئینۂ ادب ، چوک مینار - انارکلی - لاہور

یہ کہنے کے لیے کسی تبصرہ نگار کی ضرورت نہیں کہ عبدالعزیز خالد نے اُردو شاعری کا دامن اپنے چمنِ تخلیق کے پھولوں سے بھر دیا ہے - اغلباً زیادہ تر اچھے خیالات اور پاکیزہ احساسات سے جن میں نعتِ رسولؐ سب سے بڑھ کر ہے اور ساتھ ساتھ مناقب کا سلسلہ بھی چلتا ہے۔ ان چیزوں کو جب بھی پڑھا - یہی محسوس ہوا کہ خدا تعالیٰ نے اپنے اس قلم کش بندے کو ایمان سے نوازا ہے - مگر ساتھ کے ساتھ خالد کی شاعری کا ایک دوسرا میدان بھی ہے - وہاں کچھ اور ہی رنگ ملتا ہے - یعنی ذہن میں ابھی تک دو قوتوں کی کشاکش جاری ہے - ایمان کے ساتھ جو حنیفیت پیدا ہونی چاہیے وہ " فِی کُلِّ وَادٍ یَّهِیْمُوْنَ " کا اذن نہیں دیتی - مگر شاید وہ اسی منزل کی طرف بڑھ رہا ہے - کچھ وقت تو لگے گا - زمانہ ایسا ہے کہ مسلم فکر اور سیکولر فکر ادب میں اب مل کر نہ چل سکے گی - کیونکہ دونوں طرف تصورِ حیات و کائنات جدا جدا ہے ، لہٰذا اخلاقی و تہذیبی شعور بھی جدا ہے - خیر یہ معاملہ خالد کا اپنا زیادہ ہے ، ہمارا کم - ہم تو اس لیے بولنے کا حق رکھتے ہیں کہ جب کوئی شخص ہمیں مخاطب بنالے گا تو ہم اپنی سی بات ہی کہیں گے -

اس وقت خالد کی کتاب ثانی ؓ لاثانی پیشِ نظر ہے - اس میں حضرت سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مناقب بیان کیے گئے ہیں مگر انداز مناقبانہ اور قصیدہ گویانہ نہیں - بلکہ ایسا والہانہ جیسے کوئی اپنے محبوب کے کردار کے حسن و جمال کے پہلو دکھا رہا ہو - خالد نے نعت و مناقب کے اس اسٹائل کو اپنایا ہے ، جیسے شبلی ، حالی ، حفیظ اور اقبال نے اپنے اپنے رنگ میں پروان چڑھا ، یعنی کردار کے حُسن کو

تاریخی واقعات کے متحرک پردۂ قلم پر دکھانا۔ اس میدان میں خالد نے بہت پیش قدمی کی ہے۔

دو اور باتیں مجھے کہنی ہیں، اگرچہ مجھے اس کا اندیشہ بھی ہے کہ خالد صاحب کے دل میں خیال گذرے کہ تم کو کچھ کہنے کا کیا حق ہے اور میرا جواب تیار بر تیار ہے کہ تبصرہ نگاری کو تو چھوڑیے، جو بھی دوسروں کے سامنے مجھے مخاطب بناتا ہے۔ مجھے اس کے متعلق اپنے تاثرات کہنے کا حق ہے۔

پہلی بات میں یہ کہتا ہوں کہ ۸۶ ، ۷ اشعار میں اگر دس یا پانچ غیر مستعمل الفاظ کسی ضرورت شعری سے آجائیں تو گوارا، مگر اسلوب ہی یہ بنا لینا کہ عربی اور ہندی و سنسکرت کے لغتِ غریب کا ایک حصہ ہمیشہ کی طرح نظم میں کھپا دینا ہے، اسے مستحسن نہیں کہا جا سکتا۔ لوگ دقت محسوس کریں تو کہا جائے کہ جاؤ مطالعہ کرو، لغت دیکھو، محنت کرو، ورنہ میری شاعری میں کیا ڈھونڈتے ہو۔ وہ تو خیر پھر بھی اچھا ہے کہ میرے ہی ایک مشورے کے تحت انہوں نے حواشی میں لغت اور تاریخ کے حوالے درج کرنے شروع کر دیے۔ مگر بات پھر بھی درست نہیں ہے کہ اکا دکا لفظ غریب کا آجانا تو خیر، قاری اس کا مفہوم معلوم کرے گا، مگر ہر شعر میں اگر مرادفات و مترادفات اور ہم قافیہ قسم کے غریب الفاظ رکھ دیئے جائیں تو یہ شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک مصیبت ہے۔ ابلاغ کا کلیہ بھی کچھ اہمیت رکھتا ہے۔ آپ لوگوں کے لیے فکری سطح پر معلم ہیں، ان تک کوئی پیغام نہ سہی ——— احساس پہنچانا چاہتے ہیں ——— اُن کے لیے آسانیاں پیدا کیجیے۔ قرآن مجید کی زبان اس معنی میں نئی ہے کہ ایک تو فصاحت و بلاغت کا معیار اونچا ہے، دوسرے معمولی قسم کے مروج الفاظ کو بلند معانی دیے گئے ہیں۔ شاعری اور ادب کا کمال بھی یہی ہوتا ہے کہ وہ عام استعمال کے الفاظ کے انگوروں سے نئے معانی کا رس نچوڑتا ہے۔ نہ یہ کہ جہاں ایسا موقع آیا کہ مروجہ الفاظ نے ساتھ نہ دیا تو جھٹ لغت غریب کی طرف توجہ کر لی۔ ایسی شاعری سے لوگوں کو مرعوب کر سکتے ہیں۔ ان پر اپنے ہفت بحری علم کا سکہ جما سکتے ہیں، مگر آپ کے افکار و اشعار ان کے دلوں میں جڑیں چھوڑ کر گلاب و یاسمن نہیں بن سکتے کہ جنہیں وہ اپنا باغ سمجھ کر اُن سے پھول چنیں۔

خالد کی دوسری یہ روایت بھی قابلِ توجہ ہے کہ وہ عربی اور سنسکرت اور فارسی اور ہندی، بلکہ ساتھ ہی پنجابی (اس کے علاوہ مغربی زبانوں کے) الفاظ میں ٹانکے لگا دیتے ہیں۔ یہ ناہمواری اُردو شاعری کے بنیادی مزاج کے خلاف ہے۔ کہیں آپ اینٹ لگا دیں، کہیں روڑا تو بھان متی کا یہ کنبہ جُڑ تو جائے گا، مگر خوش وضع نہیں لگے گا۔ میر کا رنگ دیکھیے، غالب کا دیکھیے، بلکہ غالب کے دونوں

رنگ دیکھیے، ہندی مزاج کے گیتوں کا رنگ دیکھیے۔ مجاز اور جذبی کا کلام ملاحظہ فرمائیے، جگر اور حسرت کی شاعری پر نگاہ ڈالیے، اقبال اور مولانا ظفر علی خاں کو لیجیے، حالی، چکبست۔ اصغر گونڈوی، اختر شیرانی، فضل احمد کریم فضلی، مولانا ماہر القادری کو پڑھیے، عربی فارسی مزاج کی شاعری ہوگی تو اس میں ہندی سنسکرت کے بھاری الفاظ نہ ملیں گے، اسی طرح ہندی سنسکرت کا رنگ ہوگا تو عربی فارسی کا بوجھل لغت استعمال نہ ہوگا۔ سنگِ مرمر کی سلیں بنانی ہوں تو بنائیے اور گھر سازی و مرصع سازی کرنی ہو تو وہ کیجیے۔ لوہار اور سنار کے دونوں فنون کو یکجا کرنا ناقابلِ فہم ہے۔ یہ رنگِ خاص بھی مرعوب کن زیادہ ہے مسحور کُن کم۔

یہ تو ہماری محض باتیں ہیں، خالد بہر حال کام کر رہا ہے اور کام کرنے والے کو بسا اوقات باتوں پر توجہ کرنے کی فرصت بھی نہیں ہوتی۔ ہمارا بھی منشا یہ نہیں کہ وہ ہماری گزارشات کو دلیلِ راہ بنالیں۔

یہ کتاب اس لحاظ سے شاندار ہے کہ اوّل تو بسم اللہ کے اعداد ۷۸۶ کے مطابق تعداد اشعار رکھ کر حسنِ تفاؤل کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ دوم یہ کہ یہ کتاب اس دور میں صحیح معنوں میں "بقلم خود" ہے۔ یعنی شاعر نے خود ہی اس کی کتابت اپنے عام سادہ و باوقار رسم الخط میں کی ہے۔ کاتب آج کل کتابی و اخباری دُنیا میں وہی مقام رکھتا ہے جو اُردو شاعری میں معشوق کا ہے۔ وہ محبت بھی کراتا ہے، جادہ پیمائیاں بھی، وعدہ شکنیوں سے بھی لذت اندوز کرتا ہے۔ انتظار کی گھڑیاں گزروانا اور اختر شماری کراتا ہے۔ اور پھر الفاظ و معانی کا قتلِ عام بھی اس بے باکی سے کرتا ہے کہ ہر صفحے پر کشتوں کے پشتے لگ جاتے ہیں۔ مصنف کے قلم اور کاتب کے قلم کی قلمرو ایک ہی ہے، لہٰذا رقابت رہتی ہے۔ خالد صاحب اس قلمی و کاغذی معشوق کی ناز برداریوں سے بھی بچ گئے اور لاگت بھی کم رہی۔

کاغذ، طباعت، جلد خوب، بلکہ یوں کہیے کہ خالد صاحب نے اپنا ایک معیار قائم کر دیا ہے اس کا ہم دل سے اعتراف کرتے ہیں۔

۷۸۶ اشعار پر تحقیقی تبصرہ کرنا ان اوراق میں ممکن نہیں۔ ہم نے صرف اُوپر اُوپر سے فضائی سروے کیا ہے۔ خالد صاحب کا یہ اسلوب بھی تقریباً ثابت و قائم ہوگیا ہے کہ وہ طویل نظمیں جب لکھتے ہیں تو اُن کے آخر میں وہ پھر خود ہی اپنا موضوع بن جاتے ہیں۔ ثانیٔ لاثانی میں بھی یہی صورت ہے۔ ص ۹۷ سے یہ سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ بڑے معنی خیز اور زوردار اشعار ملتے ہیں، بلکہ مجھے اب

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ جب "بیان اپنا" پر آتے ہیں تو بہت زور پیدا ہو جاتا ہے۔ اس حصے کا ایک سرا تعلی ہوتا ہے دوسرا انکسار۔ وہ بھی حد سے بڑھ کر، اور یہ بھی انتہا سے آگے تک۔ کام کی بات یہ کہ ساتھ ہی ابنائے زمانہ کا تذکرہ چھڑتا ہے۔ کیونکہ خالد کا وجود ان سے کٹ کر الگ تو نہیں ہو سکتا۔ یہاں پہنچ کر وہ وقت کے فکری، تہذیبی اور اخلاقی ناسوروں کو خوب خوب نمایاں کرتے ہیں۔ ابنائے زمانہ کی بات چلتی ہے تو وہ تھوڑی بہت نصائح بھی کرتے ہیں، کہیں کہیں تو بھرپور زجر و توبیخ کے ساتھ۔ پھر کہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے خالد صاحب نے خود کو بھی انہی میں شامل کر دیا ہے جن کا تذکرہ ہے یہ سماں دیکھ کر ماننا پڑتا ہے کہ یہ محض انکسار نہیں، بلکہ شاعری کا کمال ہے اور شاعر یہاں اپنے آپ کو واعظ سے الگ کر دکھاتا ہے۔

مختصر یہ کہ ۵۲ صفحات اور ۸۶، اشعار کا یہ خوبصورت مجلد مجموعہ دس روپے میں اگر مل رہا ہے تو دنیا والوں کو اور کیا چاہیے۔

---

(بقیہ اسلامی انقلاب کی نفیر)

کے ہاتھوں جو انسانی خون بہہ رہا ہے[1] اس پر کسی کو اعتراض نہیں۔ حالانکہ اس پر جو اربوں ڈالر مصارف اٹھ رہے ہیں۔ اُن کا ناقابلِ برداشت بوجھ عوام کی جیبوں پر پڑ رہا ہے۔ لیکن عجب تماشا ہے کہ خود جو اسلام اپنے دفاع کا ارادہ کرے اور وہ یہی اس فتنے کی جڑ کاٹ دینے کا اعلان کرے تو یہی لوگ دہائی دینے لگتے ہیں "ارے! یہ جہاد کس لیے ہے؟"

(باقی)

---

[1] یہ بھی قرونِ مظلم سے زیادہ گندی بہیمانہ کارروائیوں کی صورت میں۔ خاص طور پر افغانستان میں تو پورا ملک ایک مذبح بنا ہوا ہے اور تہذیبِ نو کے قسائی ایک قوم کو ذبح کر رہے ہیں۔

(بقیہ اشارات) دفتروں میں، عدالتوں میں، وکلاء میں، اساتذہ میں، طلبہ میں، خواتین میں، تاجروں میں، مزدوروں میں، دکانداروں میں، صحافیوں میں، ادیبوں میں، ذرائع ابلاغ کے حلقوں میں، اسمبلیوں میں، بلدیاتی اداروں میں، چھاؤنیوں میں، تھانوں میں، دیگر پرائیویٹ فرموں اور سرکاری محکموں میں خدا پرست، دیانت دار اور خادمِ خلق لوگوں کی تعداد تیزی سے بڑھے۔ یہاں تک کہ اگر اکثریت نہ بھی ہو تو کم سے کم ہر دائرے میں ہر سطح پر ہر صلاحیت کی ایک مؤثر و فعال اقلیت متحرک ہو جائے۔

جس ملک میں تبدیلیٔ نظام کی یہ شرط پوری کر دی جائے گی۔ بلا تاخیر غلبۂ اسلام کا دور شروع ہو جائے گا چاہے انقلابی راستے سے ہو، خواہ انتخابی راستے سے۔

تو جن محبانِ دین کو کام کرنا ہو، جن کو حقیقت میں اپنے اندر کوئی بے چین جذبہ اسلامی انقلاب کے لیے محسوس ہوتا ہو اور جنہیں ناخوشگوار حالات کے موجودہ گھیرے کو توڑ کر بچ نکلنے اور تاریخ کے نقشے پر اسلام کا جھنڈا گاڑ دینے کی خواہش ہو، وہ مندرجہ بالا شرائط کو پورا کرنے کے لیے زور لگائیں۔ ورنہ سطح کے اوپر اوپر انقلاب کے نعرے لگانے اور امام خمینی کا مثنیٰ بننے کے سارے خواب پریشان ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اگر سطح کے نیچے آپ کام نہ کریں گے تو کوئی دوسری قوت اپنا تانا بانا پھیلا دے گی۔ خیال رہے کہ ہماری اس سرزمین میں دیمک بہت ہے اور سیم بھی ہے۔ چوہے بھی سرنگیں کھودتے رہتے ہیں۔ آپ اگر اوپر کسی عمارت کے اٹھانے کا نقشہ بنائیں تو اس بات کی فکر پہلے کر لیں کہ سطح کے نیچے ایسی مؤثر قوت پیدا ہو جائے جو سیم اور دیمک اور چوہوں پر قابو پا سکے۔ کچھ ایسی مساعی جن کا محض یہ اثر ہو کہ ہماری تاریک فضا میں اپنا وجود محسوس ہوتا رہے، یہ بھی بڑی اچھی بات ہے، مگر اصل فیصلہ کن امر یہ ہے کہ آپ کا وجود پھیلتا ہے یا سکڑتا ہے، یا جامد بن کے رہ جاتا ہے۔ اسے سکڑنے نہ دیجیے، اسے جامد بھی نہ ہونے دیجیے، بلکہ اس میں پھیلاؤ پیدا کرنے کی تدابیر کیجیے۔ اس کا حجم بھی بڑھے اور وزن بھی اور قدر و قیمت بھی۔

ایسا ارادہ ہو تو سخت محنت و مشقت کا کام ہے۔ فیصلہ کر لیجیے کہ آپ کو محنت و مشقت سے یہ مہم چلانی ہے۔ نہیں چلائیں گے تو آپ کا پہاڑ جیسا وجود بھی گھلتے گھلتے رائی بن کے رہ جائے گا۔ اور ایسی مہمات چلانے کے لیے کوئی ایک بنی بنائی ڈگر ہر قسم کے حالات میں کام نہیں دیتی، بلکہ بنی بنائی ڈگر پر چلتے چلتے بسا اوقات ذہنی جمود پیدا ہو جاتا ہے۔ ڈگر کو چھوڑیے اور جمود کو توڑیے

اِدارۂ ترجمان القرآن کی نئی پیشکش

جناب محمد صلاح الدین صاحب مدیر "جسارت"

کے قلم سے

# بُنیادی حقوق

پیش لفظ

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

حرفِ آغاز

محمد صلاح الدین

○

کاغذ ولایتی — طباعت آفسٹ — کور خوبصورت

سائز ۱۸×۲۲/۸

○

قیمت: بیس ۲۰ روپے

○

اِدارۂ ترجمان القرآن، اِچھرہ، لاہور